پس پردہ حقائق

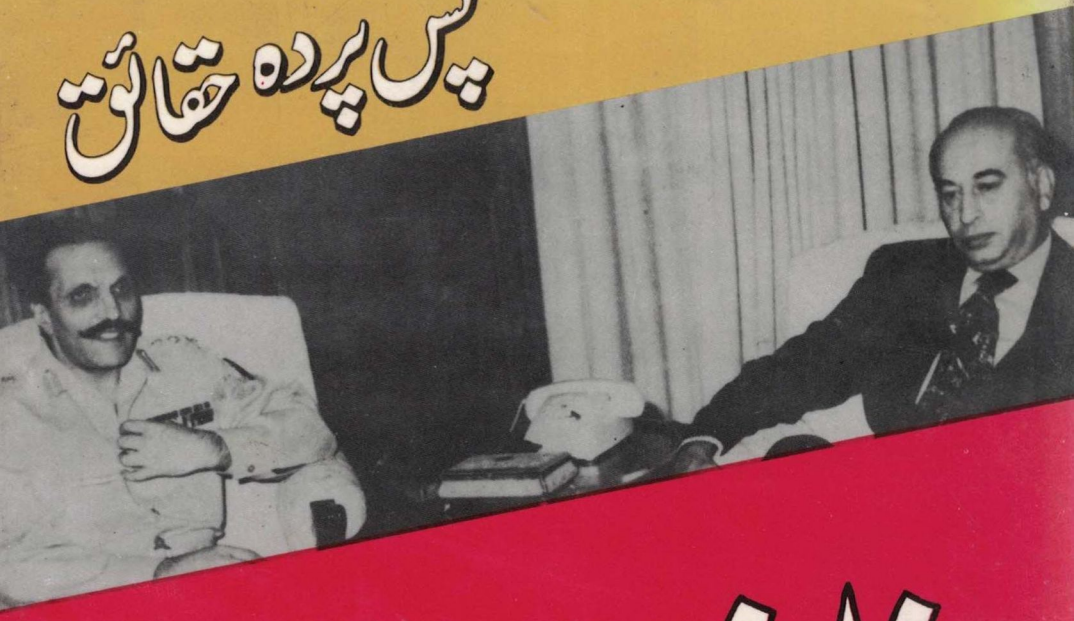

جنرل ضیاء کا اسلام؟

ظہیر سہیل

جنرل ضیاء کے گیارہ سال؟

جنرل ضیاء کے گیارہ سال؟

اظہر سہیل

فیروز سنز لمیٹڈ
لاہور - راولپنڈی - کراچی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

بار اوّل ---------- ۱۹۸۸ء

پاران ايم ايڇ پنھور انسٽيٽيوٽ آف سنڌ اسٽڊيز، ڄامشورو.

Digitized by M. H. Panhwar Institute of Sindh Studies, Jamshoro.

مطبع -- فیروز سنز لمیٹڈ لاہور

مجلّد --- ISBN 969 0 00923 0

یہ کتاب اور اس کا کوئی حصہ ناشر کی اجازت کے بغیر شائع کرنا جرم ہے۔

۱ ۔ واحد متکلم	۹
۲ ۔ نظرے خوش گزرے	۱۱
۳ ۔ بھٹو، ان کی کابینہ اور جنرل ضیاء	۱۷
۴ ۔ مباہلہ ہوتے ہوتے رہ گیا	۲۱
۵ ۔ ایک اہم اجلاس	۲۳
۶ ۔ مارشل لاء کیسے لگا ؟	۲۷
۷ ۔ سیاستدانوں کی کہہ مکرنیاں	۳۳
۸ ۔ بھٹو کی گرفتاری کا پس منظر	۳۹
۹ ۔ انتخابات ملتوی کرانے والے	۴۳
۱۰۔ اور الیکشن ملتوی ہو گیا	۴۹
۱۱۔ جنرل ضیاء کے عزائم	۵۳
۱۲۔ جب جنرل صاحب نے صدارت بھی سنبھال لی	۵۹
۱۳۔ کوئی نہ آیا بروئے کار	۶۳
۱۴۔ بھٹو کی پھانسی ۔۔۔۔ اصل روداد	۶۹
۱۵۔ شوریٰ اور اس کے بعد	۷۳
۱۶۔ اپنے ساتھیوں پر بے اعتمادی	۷۷
۱۷۔ ریفرنڈم	۸۱
۱۸۔ وزیر اعظم، وزراء اعلیٰ اور وزراء کا انتخاب	۸۳
۱۹۔ جنرل صاحب کا حلقۂ انتخاب	۸۷

۲۰۔ جمہوری تماشا ۹۱
۲۱۔ صدر کے آئندہ ارادے ۹۵
۲۲۔ ضیاء ازم کا نعرہ ۹۹
۲۳۔ پس چہ باید کرد

دستاویزات

۱ ۔ مارشل لاء کے نفاذ کا حکم نامہ ۔۔۔۔ ۵ ۔ جولائی ۱۹۷۷ء
۲ ۔ مارشل لاء اٹھانے کا حکم نامہ ۔۔۔۔ ۳۰ ۔ دسمبر ۱۹۸۵ء
۳ ۔ منتخب اداروں اور حکومت کی برطرفی ۔۔۔۔ ۲۹ ۔ مئی ۱۹۸۸ء
۴ ۔ جنرل ضیاءالحق کے طیارے کی تباہی ۔۔۔۔ تحقیقاتی رپورٹ

انہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو ۔۔ جنرل ایم ضیاءالحق دبئی کے ہیلی پیڈ پر وزیر اعظم بھٹو کا استقبال کر رہے ہیں ۔۔ ۱۱۔ نومبر ۱۹۷۶ء

گفتارِ صدق مایهٔ آزار می شود
چوں حرف حق بلند شود دار می شود

واحد متکلم

جنرل ضیاءالحق کے گیارہ سالہ دورِ حکومت میں ریڈیو ، ٹی وی اور سرکاری ذرائع ابلاغ کے ذریعہ یہ بات بہ تکرار و تسلسل دہرائی جاتی رہی کہ جنرل صاحب پاکستان کی تقدیر کے ایسے روشن ستارے ہیں جو اگر غروب ہو گئے تو چاروں جانب گھور اندھیرا چھا جائے گا ۔ ان کے حواری اور وہ خود ایک ہی بات کا اعادہ کرتے رہے کہ یہ ملک ان کے بغیر نہیں چل سکتا ۔ لیکن گیارہ برسوں کے بعد گردن موڑ کر دیکھیں اور حالات کا تجزیہ کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ ان کے ہوتے ہوئے یہ ملک چلتا کیسے رہا ۔ اپنے سے پہلے آنے والے تمام حکمرانوں کی طرح وہ بھی اقتدار اعلی کا واحد سرچشمہ اپنی ہی ذات کو بنائے رکھنے کی کوششوں میں مصروف رہے ۔ اور بدبختی کی بات یہ ہے کہ ملک کے بیشتر سیاسئین کرام بھی خفیہ یا اعلانیہ طور پر ان کی اس کارروائی میں شریک رہے ۔

یہ کتاب گیارہ سالہ دور کے محض سیاسی حصّہ پر محیط ہے ۔ جس میں بہت سے پہلوؤں کا تذکرہ دانستہ نہیں کیا جارہا کہ یار زندہ ، صحبت باقی ! ۔۔۔ ابھی اتنی سچائی بھی ہضم ہو جائے تو بہت ہے ۔

اظہر سہیل

۵ ۔ مہران بلاک
گلشنِ جناح ۔ شالیمار ۱/۵
اسلام آباد

نظرے خوش گزرے

۱۷ ۔ اگست ۱۹۸۸ء کی شام ، بہاولپور کے قریب ہونے والے ایک ہوائی حادثہ میں پاکستان ائیر فورس کا جو سی ون تھرٹی طیارہ "پاکستان ون" تباہ ہوا ۔ یہ محض ایک طیارے کی تباہی نہیں بلکہ ایک پورے دور کا خاتمہ تھا ۔ پورا ایک عہد ، جو ۴ - جولائی ۱۹۷۷ء کی شب شروع ہو کر ۱۷ - اگست ۱۹۸۸ء کی شام ، صدر جنرل محمد ضیاءالحق کی سالگرہ کے ٹھیک پانچ روز بعد ختم ہو گیا ۔ اب ان کا معاملہ اللہ تعالی کے سپرد ہے ۔ کلام اللہ کے مصداق :

ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰی عَالِمِ الْغَیْبِ والشَّھَادَۃِ فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۔

ان کی موت کے بارے میں تحقیقات کا سلسلہ تادمِ تحریر جاری ہے کہ کیا یہ محض ایک حادثہ تھا یا تخریب کاری اور اگر تخریب کاری تھی تو کس کی ؟ تخریب کاری اور تخریب کاروں کا ارضِ پاک میں عمل دخل شاید اس سے پہلے بھی ہوتا رہا ہو ، مگر جنرل صاحب کے دور میں یہ عمل بہت بڑھ گیا ۔ اس کی ایک وجہ مسئلہ افغانستان کے بارے میں ان کی حکومت کا موقف بھی تھا ۔ وہ اس موقف کو اپنے ایمان کا حصہ جانتے تھے ۔ ۵ - مارچ ۱۹۸۸ء کی شام پورے ملک کی تمام قومی سیاسی جماعتوں نے سابق وزیر اعظم محمد خان جونیجو کی زیر صدارت جمع ہو کر اس موقف کو مسترد کرتے ہوئے جنیوا سمجھوتہ پر دستخطوں کی حمایت کر دی ۔ مگر جنرل صاحب اس حوالے سے کسی نظرثانی پر تیار نہ ہوئے ۔ جونیجو حکومت کو بہت سمجھایا ، معاملات درست کرنے کی اپنی سی کوشش بھی کی لیکن جنیوا سمجھوتہ پر دستخط ہو گئے اور واقفانِ حال کا کہنا ہے کہ جنرل صاحب کی طرف سے منتخب قومی حکومت اور پارلیمنٹ کی برطرفی کے فیصلوں میں ان معاملات کی کارفرمائی بھی بدرجۂ اتم تھی ۔

جنرل صاحب کی موت کے فوراً بعد ملک میں زبردست بے چینی اور بے یقینی کی کیفیت پیدا ہو گئی ۔ اسی شام ساڑھے چھ بجے جی ایچ کیو میں ملک کے پانچ بڑوں کا ایک انتہائی اہم اجلاس ہوا ۔ عام

خدشہ یہی تھا کہ اب ایک بار پھر مارشل لاء لگ جائے گا اور اس کی کافی وجوہ بھی موجود تھیں ۔ لیکن فوج کے تینوں سربراہوں ، جائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین اور چیئرمین سینٹ کے اس اجلاس میں آخر کار یہی طے پایا کہ ملک میں آئین کی حکمرانی کا آغاز کیا جائے اور آئین میں یہ لکھا ہے کہ صدر کی ناگہانی موت کی صورت میں چیئرمین سینٹ ملک کے سربراہ بن جائیں گے ۔۔۔۔ یوں چیئرمین سینٹ غلام اسحق خان ، صدر غلام اسحق خان بن گئے ۔ شروع شروع میں عام تاثر یہی تھا کہ وہ مضبوط پشت پناہی سے محروم محض ایک آئینی فقرہ کی روشنی میں بن جانے والے حکمران ہیں جنہیں کٹھ پتلی کے طور پر استعمال کیا جائے گا ۔ اور شائد یہی تاثر تھا جس کے تحت ایک صوبائی وزیر اعلی نے اُسی رات ، اُن سے سخت لہجہ میں بات کرنے کی کوشش کی مگر چیف آف آرمی سٹاف مرزا اسلم بیگ نے ٹوکتے ہوئے کہا ، "۔۔۔۔۔ حدّ ادب ملحوظِ خاطر رہے ، آپ کو معلوم ہونا چاہئیے کہ آپ صدرِ مملکت سے مخاطب ہیں ۔"

اور پھر چشمِ فلک نے یہ منظر بھی دیکھا کہ "ضیاء ازم" کے وارثوں نے جنرل صاحب کا کفن تک میلا نہیں ہونے دیا ۔ سازشیں اور طالع آزمائیاں اپنے پورے عروج پر پہنچ گئیں ۔ جس وقت جنرل ضیاءالحق کا تابوت لایا گیا ، اسلام آباد ائیر پورٹ کے رن وے پر "ضیاء ازم" کے پس ماندگان باہم دگر گوش بلب اپنے ہی جوڑ توڑ میں مصروف تھے ۔ جنازے پر جمع ہونے والے انبوہِ خلائق کو دیکھتے ہی اُنہوں نے "ضیاءالحق کے ورثہ کا امین" ہونے کا اعلان بھی کیا لیکن آہستہ آہستہ جب دھند چھٹنے لگی اور سپریم کورٹ کے فاضل ججوں نے جنرل صاحب اور ان کے دور کو اپنے فقروں کی زد پر رکھ لیا تو

پھول مہنگے ہوگئے ، قبریں پرانی ہو گئیں !

جنرل ضیاءالحق کے سیاسی جانشینوں نے ایک بار پھر محمد خان جونیجو کو اپنا سربراہ تسلیم کر لیا ۔ حالانکہ یہی محمد خان جونیجو تھے جنہیں ۱۳ - اگست ۱۹۸۸ء کی دوپہر اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں وہ ملّاحیاں سنائی گئیں کہ مضحک و انشاء کی معاصرانہ چشمکیں بھی ماند پڑگئیں ۔ اس سیاسی دھچکے سے جنرل ضیاءالحق کی اپنی ذاتی تاریخی اہمیت کم نہیں ہوتی ۔ ایک ایسا ملک ، جس کی کل عمر ہی چالیس سال ہو ، اُس پہ گیارہ برس تک حکومت کرنے والے کسی بھی حکمران سے صرفِ نظر کرکے ، تاریخ آگے کیوں کر بڑھ سکتی ہے ۔ جنرل ضیاءالحق ، بلاشبہ ایک پورے عہد کی تنہا شخصیت تھے ۔ ایسی شخصیت ، جس کے بارے میں موافق و مخالف دونوں آراء پوری کیفیت اور کمیت کے ساتھ سامنے آتی چلی جا رہی ہیں ۔ اور آئندہ آنے والے حکمرانوں کو بہر حال جنرل صاحب کے دورِ حکومت سے بہت کچھ سبق سیکھنا ہوگا ۔

جنرل ضیاءالحق کے گیارہ سالہ دورِ حکومت کا تجزیہ کیا جائے تو قومی سطح پر صرف ایک ہی احساس جی میں ابھرتا ہے اور وہ یہ کہ ان گیارہ برسوں میں قوم عملاً ۵ - جولائی ۱۹۷۷ء سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکی اور ۱۷ - اگست ۱۹۸۸ء کی شام ان کی موت کے بعد سیاسی طور پر وہی متخالف و متحارب دھڑے باہم دگر برسرِ پیکار

تھے ، جنہیں محاذ آرائی سے روکنے کے لیے جنرل صاحب نے ۵ - جولائی ۱۹۷۷ء کو اقتدار سنبھالا تھا ۔

داخلی اور خارجی دونوں حوالوں سے ان کا دور اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کہ اُنہوں نے دونوں محاذوں پر جو فیصلے کئیے ، وہ ایک تنہا آدمی کے فیصلے تھے ۔ جنہیں اگر کسی فرد ، گروہ یا ادارے کی حمایت حاصل تھی بھی تو اُسے عوامی غیظ کے مقابل کھل کر جنرل صاحب کی حمایت میں کھڑا ہونے کی ہمت نہیں ہوئی ۔ اُنہوں نے انتخابی عمل کو جتنی بار ملتوی کیا ، ہر چند کہ بعض سیاستدانوں کو ساتھ ملا کر کیا ، مگر ان کے یہ حلیف بھی اُن کی حمایت محض ایک نیم دلانہ خاموشی ہی کے ساتھ کرسکے ۔ انہوں نے جب بعض سخت سیاسی فیصلے کئے ، حتیٰ کہ ذوالفقار علی بھٹو کے لیے کی جانے والی رحم کی اپیل بھی مسترد کی دی تو عملاً یہی حال رہا کہ اُن کے یہ حلیف ظاہری طور پر معافی دے دینے ہی کے حامی رہے ۔ لے دے کر ایک پیر صاحب پگارا نے رحم کی اپیل کے خلاف مؤقف اختیار کیا تو اس کے پیچھے بھی جنرل صاحب کی حمایت سے زیادہ پیر صاحب اور بھٹو مرحوم کا ذاتی مناقشہ کارفرما تھا ۔ خارجی حوالوں سے اُنہوں نے بین الاقوامی موضوعات پر جو مؤقف اختیار کیا ۔ اُسے بھی پاکستان کا "قومی مؤقف" شاید ہی قرار دیا جاسکے ۔ جس انداز میں وہ بھارتی نیتاؤں کے سامنے سرنگوں ہوتے رہے ، جس طریقہ سے اُنہوں نے افغان مہاجرین کی ایک کثیر تعداد کو پاکستان میں آکر کُھل کھیلنے کی اجازت دی ، جس طور پر اُنہوں نے بیرونِ ملک مُقیم غریب پاکستانی کارکنوں کے تحفظ سے گریز کیا ، یہ سب باتیں اپنی جگہ ایسے ناسور ہیں ، جن کا فاسد مادہ آہستہ آہستہ رس کر باہر آنا شروع ہوگیا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ جب حقائق عوام کے سامنے آئیں گے تو قوم کو اندازہ ہو گا کہ وہ گیارہ برس تک جس دھندلکے میں اسیر رہی ، اُس کے پار بھی نئی صبحوں کے پڑاؤ تلاش کرنے کے لیے ابھی بہت سفر کرنا پڑے گا ۔

اس امر کا قطعی طور پر تعین شاید ہی کبھی ہو سکے کہ جنرل صاحب نے کب اور کس لمحے اپنے ذاتی اقتدار کو دوام دینے کا فیصلہ کیا اور پھر اس کے لیے اپنی کارروائیاں شروع کر دیں لیکن یہ بات طے ہے کہ شروع شروع میں اگر بعض سیاسی رہنما اپنے ذاتی سیاسی عناد کی خاطر ایک مستبد آمر کی حمایت نہ کرتے تو شاید صورتِ حالات مختلف ہوتی ۔ وہ جو شاعر نے کہا تھا کہ ۔

کُچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کُچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

تو جنرل ضیاء الحق کے ساتھ بھی یہی ہوا ۔ اُنہوں نے چونکہ عملی زندگی بہت نیچے سے شروع کی تھی ، اس لیے زندگی کی تمام دھوپ چھاؤں سے کماحقہ آگاہ تھے ۔ اُنہیں یہ فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی انگریزی پالیسی پر عمل کرکے اپنے اقتدار کو حسب دل خواہ طول دے سکتے ہیں ۔ اور جب ایک بار اُنہوں نے یہ فیصلہ کر لیا تو پھر مشیرانِ کرام کی کیا کمی تھی جنرل صاحب کے گیارہ سالہ دور پہ تفصیلی نگاہ ڈالی جائے تو اندازہ ہو گا کہ اُنہوں نے اپنی اس پالیسی پر ہر دور اور ہر ادارے میں عمل کیا ۔

بھٹو کی پھانسی بھی گویا متحارب قوتوں کی نبرد آزمائی کو برقرار رکھنے بلکہ تیز تر کرنے کے بنیادی فیصلہ کا حصہ تھی ۔ ورنہ بھٹو صاحب سے اُنہیں کوئی ذاتی پرخاش نہیں تھی ۔ اُنہوں نے تو ملتان میں صادق حسین قریشی کی اقامت گاہ وائٹ ہاؤس میں کلام اللہ بدست بھٹو صاحب کو یہ یقین دلایا تھا کہ "سر ! آپ اس قوم کے اتنے بڑے محسن ہیں کہ آپ سے بڑے کسی ہیرو کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا ۔ اور آپ کو قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں آپ اور آپ کے خاندان کا وفادار رہوں گا ۔"
اُنہوں نے اپنے اس عہد کی تجدید جون ۱۹۷۷ء میں بھی کی جب وہ کسی سرکاری اجلاس کے سلسلہ میں بھٹو صاحب سے ملنے ایوانِ وزیراعظم آئے ۔ اجلاس ختم ہوا اور بھٹو صاحب ائیرمارشل ذوالفقار علی خان کے ہمراہ واپس جانے لگے تو پیچھے سے آہٹ سن کر رُک گئے ، دیکھا تو جنرل محمد ضیاءالحق کھڑے تھے ۔ جنرل صاحب نے کہا "جناب ! میں آپ کو یہ یقین دلانے آیا ہوں کہ میں ہمیشہ آپ کا احسان مند اور تابع فرمان رہوں گا ۔"

بھٹو صاحب سے ان کی لڑائی کوئی اصولی لڑائی نہیں تھی ۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اُن کے خلاف ملک توڑنے کا مقدمہ چلاتے ، یہ ایک ایسا الزام تھا جس کی تحقیقات پوری قوم چاہتی تھی ، مگر اُنہوں نے ایک مقامی نوعیت کے قتل کا مقدمہ تلاش کرکے بھٹو سے نجات پانے کا فیصلہ کیا کہ ان کے نزدیک اسی طرح بھٹو کی موت یقینی بنائی جاسکتی تھی ۔

اور پھر جب اُن کے پاس رحم کی اپیل آئی تو اُنہوں نے قتل کے مجرم کو معاف نہ کرنے کا اصولی مؤقف اختیار کر لیا ۔ حالانکہ مجرموں کو معافی نہ دینے والے اس حکمران نے شبنم ڈکیتی کیس کے مجرموں کو معاف کر دیا تھا ۔

مذہبی فرقوں کے درمیان بھی اُنہوں نے محض منافرت کو ہوا دی ، شیعہ سنی ہوں یا دیو بندی ، وہابی اُنہوں نے ان کے درمیان خلیجیں گہری کرنے اور اپنا انتداب قائم رکھنے کی پالیسی اختیار کی ۔ اُن کے عہد میں جتنے مذہبی فسادات ہوئے، مسلمانوں نے مسلمانوں کا جتنا خون بہایا، اس کی مثال شاید ہی ماضی میں کہیں ملتی ہو ۔ اُنہوں نے مذہب کے نام پر چُن چُن کر ایسے عناصر کو اپنے گرد اکٹھا کیے رکھا جنہیں دینی حلقوں میں کسی وقار یا احترام کا مستحق سمجھا جانا تو ایک طرف ، بہ نظرِ استحسان بھی نہیں دیکھا جاتا تھا ۔

سیاسی میدان میں اُنہوں نے سیاسی فکر کے حامل افراد کو دور رکھنے اور قوم کو گلی محلہ کی سیاست میں ملوث رکھنے کے لیے ہمیشہ بلدیاتی نظام پر زور دیا ۔ گاہے ماہے بلدیاتی نمائندوں کو بُلا کر تھپکی بھی دیتے رہے تاکہ نچلی سطح پر اُن کا پروپیگنڈا جاری رہے اور قوم اہم سیاسی امور کے بارے میں سوچنا چھوڑ دے ۔ ان کی تمام پالیسیاں ایک فرد کی سوچ کا نتیجہ ہوتی تھیں ۔ ایسا فرد ، جس کی سب سے بڑی دلچسپی اپنے ذاتی اقتدار کا دوام تھا ۔ اس دوامِ اقتدار کی خاطر اُنہوں نے افغانستان کی اندرونی جنگ کو پاکستان کا

صدر فضل الٰہی چوہدری، وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو سے ان کے عہدہ کا حلف لے رہے ہیں ۔۔ راولپنڈی ۲۸ ۔ مارچ ۱۹۷۷ء

قومی مسئلہ بنا دیا اور کیفیت یہ ہو گئی کہ امریکی سی آئی اے کے ایک ڈائریکٹر CASSIE کی یاد داشتوں کے مطابق اسلام آباد دنیا میں سی آئی اے کے عظیم تربن اڈوں میں سے ایک بن کر رہ گیا ۔ اور یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان میں ہیروئن کی وبا بھی افغانستان ہی کے ذریعہ پہنچی ورنہ اس کی سمگلنگ کا تو راستہ ہی اور تھا ۔

انہوں نے اپنے گرد چن چن کر ایسے لوگ اکٹھے کر لیے جن کا واحد تعارف ، جنرل صاحب سے ان کا تعلق تھا ۔ زندگی کے ہر شعبہ میں نکھد اور نالائق لوگوں کو آگے بڑھایا گیا تاکہ تازہ ہوا کے راستے بند کر کے قومی سطح پر مفلوج سوچوں کو فروغ دیا جاسکے ۔

سیاست اور سیاسی عمل سے اُنہیں شدید نفرت تھی ۔ اس عمل کو ختم کرنے کے لیے انہوں نے بہت سے منصوبوں پر عمل کیا اور ابھی بہت سے منصوبے باقی تھے کہ ۱۷ - اگست ۱۹۸۸ء کی شام بہاولپور کے قریب ہوائی حادثہ نے اُن کی جان لے لی ۔ ۵ - جولائی ۱۹۷۷ء کو شروع ہونے والا دور عملاً اسی شام غروب ہو چُکا تھا مگر جنرل صاحب نے اپنے گرد مفاد پرستوں کا جو گروہ اکھٹا کر رکھا تھا ، اُنہوں نے ایک آخری کوشش کے طور پر "ضیاء ازم" کو تحریک بنانا چاہا ۔ اہل الرائے افراد اور اداروں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ عدالتوں نے اپنا کردار ادا کیا اور کیفیت یہ ہو گئی کہ پاک فوج کے نئے سربراہ مرزا اسلم بیگ کے بقول "فوج اور عدالتیں اپنا فریضہ انجام دے چکیں ، اب یہ سیاستدانوں پر منحصر ہے کہ وہ قوم کیلئے کون سی راہِ عمل متعین کرتے ہیں"

جہاں تک قوم کا تعلق ہے اقبال نے درست ہی کہا تھا کہ ۔

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

.....○.....

بھٹو ، ان کی کابینہ اور جنرل ضیاء

مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کو پاکستان قومی اتحاد کی جماعتوں نے مسترد کر دیا تھا مگر اُس وقت کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے شروع شروع میں اس استرداد کی کوئی پذیرائی نہیں کی ۔ بھٹو صاحب کے گرد موجود اُن کے حواریوں نے بھی اسے شکست خوردہ عناصر کے واویلا سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دی آہستہ آہستہ یہ واویلا بڑھتا گیا اور وزیراعظم بھٹو نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ بات بگڑتی چلی جا رہی ہے ۔ اُنہوں نے قومی اتحاد کے حلقوں میں اختلاف پیدا کرنے کے لئے بعض آزمودہ سیاسی مہروں کو بھی آزمایا ، بعض ایسے سیاسی رہنماؤں کی خدمات حاصل کی گئیں جو انٹیلی جنس کے ایماء پر پہلے بھی حکومت کے لئے اس نوعیت کی خدمات سر انجام دیتے رہے تھے ، مگر تحریک تھی کہ بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی ، دراصل اب یہ تحریک قائدین سے زیادہ عوام کی تحریک بن چکی تھی اور عوام آہستہ آہستہ خود لیڈروں پر حاوی ہو گئے تھے ۔ اگر یہ لیڈر چاہتے بھی تو تحریک کی گاڑی کو بریک لگانا مشکل ہو چکا تھا ۔ ایسے میں چاہئے تو یہ تھا کہ بھٹو صاحب انتظامی اداروں کے ذریعہ معاملات کو کچلنے کی بجائے ، سیاسی انداز میں ان کا حل پیش کرتے ۔ خود بھٹو صاحب شاید چاہتے بھی یہی تھے ، مگر اُن کے مشیرانِ کرام اور وفاقی کابینہ میں ان کے بعض ساتھی دوبارہ انتخابات سے خوفزدہ تھے ۔ مئی ۱۹۷۷ء کے ابتدائی دنوں میں تو ایک بار یوں بھی ہوا کہ ذوالفقار علی بھٹو نے وفاقی کابینہ کا اجلاس خاص اسی مقصد کے لئے طلب کیا کہ اس میں دوبارہ انتخابات کے انعقاد پر غور کیا جائے ۔ بھٹو صاحب نے اس بارے میں اپنے رفقاء کی ۔ رائے طلب کی تب انور عزیز چودھری زراعت اور زرعی انتظام کے وفاقی وزیر تھے ان کا نام انگریزی حرف اے سے شروع ہوتا ہے اور چونکہ کابینہ میں نشستوں کی ترتیب انگریزی حروفِ تہجی کے حساب سے ہوتی تھی ، اس لئے سب سے پہلے اُنہی کو اس موضوع پر اظہارِ خیال کے لئے کہا گیا ۔ اُنہوں نے کہا :

" جنابِ وزیراعظم ! میرے خیال میں تو ہمارے لئے بہترین سیاسی طریقہ یہی ہے کہ آپ دوبارہ

انتخابات منعقد کرانے کا اعلان کر دیں ، کیونکہ عوام میں ہمارے انتخاب پر شک و شبہ کی فضاء پائی جانے لگی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اس حوالے سے ازخود کوئی بہادرانہ اقدام کر دینا چاہیئے تاکہ قومی اتحاد والوں کو عوامی دباؤ بڑھانے کا موقع نہ مل سکے ۔ ۔ ۔ ۔"

انور عزیز چودھری ابھی یہی کہہ پائے تھے کہ ایک نسبتاً سینیئر اور بھٹو صاحب کے قریبی وفاقی وزیر مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ نے سخت بے تابی اور اشتعال کے عالم میں مداخلت کرتے ہوئے کہا :

"آپ کا مطلب یہ ہے کہ خود قائدِ عوام ذوالفقار علی بھٹو کا انتخاب بھی غلط ہوا ہے ؟ آپ چاہتے ہیں کہ چند للوا بتھوا قسم کے لوگوں کی جانب سے قائد عوام کے متعلق کی جانے والی بے سروپا باتوں کو تسلیم کر لیا جائے ۔ مسٹر چودھری ! شاید آپ کو اندازہ نہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ؟"

پیرزادہ صاحب نے جس کمال چابک زبانی کے ساتھ انور عزیز چودھری کو قائدِ عوام کے سامنے لا کھڑا کیا تھا ، اس کے بعد ظاہر ہے کہ اُنہیں دوبارہ زبان کھولنے کی ہمت نہیں ہو سکتی تھی ، مگر میر تاج محمد جمالی چونکہ اکل کھرے آدمی تھے اور ابھی ان میں وہ سیاسی حکمتِ عملی نہیں آئی تھی جو اَب ان کی شخصیت کا طرۂ امتیاز بن چکی ہے ، اس لئے اُنہوں نے اپنے جذبات کا اظہار انتہائی کھردرے انداز میں سیدھے سبھاؤ کر دینا مناسب سمجھا ، یوں بھی انور عزیز چودھری سے اُن کی ذاتی دوستی تھی ، اس لئے پیرزادہ صاحب کی بات ختم ہوتے ہی جمالی صاحب نے بھنائے ہوئے لہجہ میں براہِ راست بھٹو صاحب سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا :

" سر ! کیا ہم بے غیرت ہیں جو الیکشن سے بھاگ رہے ہیں ۔ مجھے تو کوئی تکلیف نہیں ، چاہے دس بار الیکشن کرا لئے جائیں ۔ بلکہ یہ تو ہمارے لئے اور بھی اچھا ہوگا ۔ آپ خوشامدیوں کی باتوں میں نہ آئیں اور الیکشن کا اعلان کر دیں ۔"

جمالی صاحب کی اس بات کے جواب میں پیرزادہ صاحب نے بھی بپھرے ہوئے لہجہ میں کوئی جواب دینا چاہا ، مگر بھٹو نے اُنہیں روک دیا اور ماحول کی تلخی کم کرنے کے لئے اپنے ایک اور رفیق وفاقی وزیر مخدوم سید حامد رضا گیلانی سے پوچھا کہ وہ اس معاملے میں کیا رائے رکھتے ہیں ۔ مخدوم صاحب جہاں دیدہ آدمی ہیں ، اُنہوں نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں بات شروع کرتے ہوئے کہا :

"جناب وزیر اعظم ، میرا خیال ہے کہ ہمیں جذباتی نہیں ہونا چاہیئے ، ہم دوبارہ انتخابات کرا بھی سکتے ہیں اور نہیں بھی کرا سکتے ۔ دونوں باتوں کے حق میں کافی وزنی دلائل موجود ہیں اور دونوں باتوں کی اپنی اپنی جگہ پر اہمیت ہے ۔ اب فیصلہ تو ظاہر ہے کہ وزیر اعظم ہی کا چلے گا ۔ آپ نے ملک کو بڑے بڑے بحرانوں سے نکالا ہے ۔ آپ جو فیصلہ کریں گے ، وہی ہم سب کا فیصلہ بھی ہوگا ۔"

بھٹو صاحب نے حامد رضا گیلانی کی بات سُنی تو ہنستے ہوئے بولے :

فضل الٰہی چوہدری، بھٹو دور کی آخری وفاقی کابینہ سے حلف لے رہے ہیں

"مجھے معلوم تھا ، حامد ، مجھے معلوم تھا ، تم اسی طرح کا جواب دوگے ، براہِ کرم اپنی یہ ملتانی روش چھوڑو اور سیدھی بات کرو کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے ۔"

اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا اور بات آگے چل پڑی ، لیکن اجلاس کے شرکاء کی اکثریت کا مشورہ یہی تھا کہ بھٹو صاحب کو دوبارہ انتخابات سے گریز کرنا چاہیئے ۔ کیونکہ اس سے ان کی کمزوری ظاہر ہوگی ۔ اور قائدِ عوام کبھی کمزور نہیں ہو سکتے ۔

اس موقع پر بعض رفقاء نے مشورہ دیا کہ بھٹو صاحب کو اس موضوع پر ریفرنڈم کرا لینا چاہیئے کہ عوام اُنہیں چاہتے ہیں یا نہیں ۔

ایک وزیر نے پورے اعتماد کے ساتھ ، مداہنت سے بھرپور لہجہ میں یقین دلایا :

"جناب وزیراعظم ! آپ کی عظمت اور عوامی مقبولیت سے خود قومی اتحاد والے بھی اتنے مرعوب ہیں کہ آپ کے ساتھ بات کرتے ہوئے ان کی سٹی گم ہو جاتی ہے ۔ اگر آپ اُنہیں ریفرنڈم کے ذریعہ چیلنج کریں تو وہ لازماً میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں گے ۔"

کابینہ کا اجلاس ختم ہوا تو بھٹو صاحب کی جبیں پر تفکر اور تردّد کی شکنیں صاف دکھائی دے رہی تھیں ۔ وہ ساری شام اُنہوں نے سوچتے ہوئے گزاری ۔ رات گئے بعض رفقاء سے فرداً فرداً بھی مشورہ کیا اور آخر کار ۱۲ – مئی کو ریفرنڈم کے حق میں فیصلہ کرکے ، عوام اور قومی اسمبلی کو اس فیصلہ سے آگاہ کر دیا ۔

پی ایں اے کے لیڈر تب اکثر و بیشتر سہالہ جیل میں نظر بند تھے مگر اُن کے ترجمان پیپلز پارٹی نے ۱۴ – مئی ہی کو ایک تحریری بیان کے ذریعہ اس ریفرنڈم کو مسترد کر دیا جس کے بعد ۱۵ مئی کو اُنہیں بھی اسلام آباد کی ہل روڈ پر واقع اُن کے بنگلہ میں نظر بند کر دیا گیا ۔ مگر سندھ ، خاص طور سے سانگھڑ میں اس نظر بندی کے خلاف ہونے والے شدید ردِّعمل کے بعد اُنہیں چھوڑ دیا گیا ۔ اس دوران بھٹو صاحب اور قومی اتحاد کے لیڈروں میں اندرونِ خانہ مذاکرات کا سلسلہ شروع ہو چُکا تھا ۔ مگر بیل تھی کہ منڈھے چڑھتی دکھائی نہیں دے رہی تھی ۔ بھٹو صاحب ان دنوں پی ایں اے کے لیڈرانِ کرام سے جو تبادلۂ خیال کرتے ، بعد میں وفاقی کابینہ کے رفقاء کو بھی اس سے آگاہ کر دیا جاتا ۔ ان اجلاسوں میں اُس وقت کے چیف آف آرمی سٹاف جنرل محمد ضیاءالحق بھی شریک ہوا کرتے ۔ دراصل بھٹو صاحب کے ذہن میں یہ بات آچکی تھی کہ اس تحریک کو اگر مزید بڑھنے دیا گیا تو ملک مارشل لاء کے نرغہ میں آجائے گا ۔ شاید اسی لئے وہ مارشل لاء لگانے والے ممکنہ کردار کو بھی اپنے ساتھ شریک و شامل رکھنا چاہتے تھے ۔

مباہلہ ہوتے ہوتے رہ گیا

قومی اتحاد کے لیڈر سہالہ میں نظر بند تھے ۔ بھٹو صاحب اور ان کے ایلچیوں سے ان لیڈروں کی ملاقاتیں بھی جاری تھیں ، مگر تحریک تھی کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہی تھی ۔ اس میں پولیس کا بھی ایک خاص کردار تھا ۔ پولیس افسران قومی سطح پر چلنے والی اس تحریک کو چوروں کے ساتھ پولیس مقابلہ کے انداز میں نمٹانا چاہتے تھے ۔ ۹ ۔ اپریل کو لاہور کی خواتین پر "تتھ فورس" سے جو حملہ کرایا گیا ، وہ گویا اس رویہ کا شاہکار تھا ۔ خود بھٹو صاحب بھی دباؤ کے عالم میں غلطی پر غلطی کرتے چلے جا رہے تھے ۔ اُن کی کابینہ کے ایک سابق رکن اور پارٹی کے ڈپٹی سیکرٹری جنرل سید ناصر علی رضوی نے اُنہیں ایک پلان دیا ، اس پلان میں "دعوتِ مباہلہ" بھی شامل تھی ۔ یہ دعوتِ مباہلہ ، مولانا کوثر نیازی کی طرف سے مرحوم مولانا سیّدابوالاعلیٰ مودودی کو دی جانا تھی ۔ نفسِ مضمون کچھ اس نوعیت کا تھا کہ :

"میں ، مولانا کوثر نیازی ، وفاقی وزیر برائے مذہبی امور ، جماعت اسلامی کے سربراہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ ایک امریکی ایجنٹ ہیں ۔ اگر اُنہیں اس حقیقت سے انکار ہو تو میں اُنہیں دعوت دیتا ہوں کہ آئندہ جمعۃالمبارک کو لاہور کی بادشاہی مسجد میں میرے ساتھ مباہلہ کر لیں ۔ میں بھی اپنے بیوی بچوں کو لے کر مسجد میں آ جاؤں گا ، وہ بھی آ جائیں ۔ نمازِ جمعہ کے بعد ہم دونوں اس بات کا حلف لیں گے کہ ہم سچ کہتے ہیں پھر دونوں اللہ سے دعا کریں گے کہ وہ جھوٹے پر اپنا عذاب نازل فرمائے ۔" مباہلہ کی اس تجویز کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے بھٹو صاحب کو یہ تجویز بھی دی تھی کہ پہلے صوبائی حکومتوں کے وزراء پھر قومی اسمبلی کے اراکین اور آخر میں صوبائی اور قومی حکومتوں کے مختلف وزراء کی جانب سے مختلف مقامات پر یہ بیان دلوائے جائیں کہ پاکستان میں موجود امریکی سفارت خانہ اور امریکی حکام اُنہیں پیپلز پارٹی چھوڑنے پر آمادہ کر رہے ہیں ۔ ان بیانات کے نتیجہ میں ایک خاص فضاء تیار ہوگی ، جس میں بھٹو صاحب ایک جلسۂ عام منعقد کر کے یہ اعلان کریں کہ امریکی حکومت میرا سر لینے کے درپے

ہے ۔" بھٹو صاحب نے رضوی صاحب کی ان تجاویز کو بہت پسند کیا ، مگر اُن سے غلطی یہ ہوئی کہ پیشگی فضاء بنائے بغیر ہی راولپنڈی صدر جا پہنچے اور ایک مبینہ امریکی خط لہراتے ہوئے اس امر کا اعلان کر دیا کہ امریکی حکومت اُنہیں اقتدار سے نکالنا چاہتی ہے ۔ یہ بات اُنہوں نے اتنی اچانک اور ایسے غیر منظم انداز میں کی کہ عوامی حلقوں میں مطلوبہ تأثر قائم نہ ہو سکا ۔ یہ سراسر بھٹو صاحب کے اپنے اندازے اور طریقِ کار کی غلطی تھی ۔ مگر اُنہوں نے اسے ناصر رضوی کے منصوبہ کی خرابی سے تعبیر کیا اور یوں مباہلے والی بات بھی درمیان میں رہ گئی ۔

اس کے بعد اُنہوں نے جمعہ کی چھٹی ، ریس پر پابندی اور شراب کی ممانعت جیسے اقدامات کئے اور اُن کے سابق ملٹری سیکریٹری ، اُس وقت کے بریگیڈیر ، بعد کے میجر جنرل امتیاز کے بقول بھٹو صاحب نے جس روز شراب پر پابندی کا اعلان کیا ، اس کے بعد سے خود بھی شراب چھوڑ دی ۔ مگر یہ سب باتیں مطلوبہ تأثر قائم نہ کر سکیں ۔ عوام گلیوں میں گولیوں کا مقابلہ گالیوں سے کرتے رہے اور بھٹو حکومت ، جو اپنے قیام کے وقت ملک کی مضبوط ترین سیاسی حکومت تھی ، روز بروز کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی گئی ۔ جنرل ضیاءالحق ، جنہیں بھٹو صاحب نے خاص طور پر ، آٹھ جرنیلوں کو نظر انداز کر کے چیف آف دی آرمی سٹاف بنایا تھا ، بھٹو کے قریب ترین معتمد بن چکے تھے ، بھٹو دن میں دو دو بار اُنہیں مشورے کے لئے طلب کرتے اور جنرل صاحب ہمیشہ سینہ پر ہاتھ رکھ کر پورے ادب کے ساتھ نیم خمیدہ کمر کے ساتھ اُنہیں یقین دلاتے کہ :

"سر ! مسلّح افواج پوری طرح آپ کا ساتھ دیں گی ۔ میرے ہوتے ہوئے ، آپ کو بالکل فکرمند نہیں ہونا چاہیئے ۔"

.....○.....

ایک اہم اجلاس

بھٹو صاحب سے ملاقات کے بعد جنرل ضیاءالحق ہمیشہ سیدھے جی ایچ کیو آتے جس کے بعد ان کے دفتر میں جی ایچ کیو کے تمام پرنسپل سٹاف افسروں کا اجلاس ہوتا ۔ اس اجلاس میں جنرل صاحب اپنے رفقاء کو تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کرتے ۔ وقفے وقفے سے تمام کور کمانڈروں کو بھی ان اجلاسوں میں طلب کیا جاتا ۔ یہ سلسلہ اپریل ۱۹۷۷ء کے اواخر میں شروع ہوا مگر اس حوالے سے اہم ترین اجلاس ۱۶ – مئی ۱۹۷۷ء کو راولپنڈی کے جی ایچ کیو میں واقع چیف آف آرمی سٹاف کے دفتر سے ملحق کانفرنس روم میں ہوا ۔ اس میں تمام کورکمانڈرز کے علاوہ چیف آف جنرل سٹاف جنرل عبداللہ ملک ، ڈائریکٹر ملٹری انٹیلی جنس ، ایم جی او جنرل جمال سید میاں اور بعض دیگر پرنسپل سٹاف افسران شریک تھے ۔

کراچی کے کورکمانڈر جنرل جہانزیب ارباب نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ "ملک میں صورتِ حالات انتہائی خراب ہو چکی ہے ۔ خاص طور سے میری کور کے حالات خراب ہیں ۔ انتخابات میں کُھلم کُھلا دھاندلی ہوئی اور ہم سب نے اسے دیکھا ۔ عوام نے بھی اسے ملاحظہ کیا ۔ اب وہ سڑکوں پر نکل آئے ہیں تو وزیراعظم بجائے دوبارہ انتخابات کرانے کے ریفرنڈم کی تجویز لے آئے ہیں ۔ میں پوچھتا ہوں ، اگر ریفرنڈم ہو سکتا ہے تو الیکشن کیوں نہیں ہو سکتا ؟ نہیں جناب ، یہ صرف نو آدمیوں یا نو لیڈروں کی تحریک نہیں ، یہ گزشتہ پانچ سالوں کی کارروائیوں کے خلاف ردِعمل ہے ، یہ تحریک اتنی ہی نہیں جتنی نظر آرہی ہے بلکہ معاملہ اس سے کہیں آگے کا ہے ۔ آپ دیکھیں کہ صرف لاہور میں اس تحریک کے لئے پچھتر لاکھ روپے جمع ہو چکے ہیں ۔ اب یہ تحریک حکومت اور وزیر اعظم کے خلاف نفرت کی تحریک بن چکی ہے ۔ حکومت کی مخالف طاقتیں بھی کمزور نہیں بلکہ یہ انتہائی طاقتور قوتیں ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ عوام پوری طرح ان کے ساتھ ہیں ۔ پولیس نے حسبِ معمول ایک نالائق ادارے کا کردار ادا کیا ہے ۔ یہ پولیس ہی کی کمزوری ہے جس سے معاملہ یہاں تک آپہنچا اور امن و امان قائم رکھنے والے اداروں کا خوف عوام

کے دلوں سے اُٹھ چُکا ہے ۔ تاہم یہ امر خوش آئند ہے کہ فوج کو ابھی تک ایک غیر جانبدار ادارہ سمجھا جا رہا ہے ۔ اگر اس ادارے کو بھی امن و امان قائم رکھنے کے لئے استعمال کیا گیا تو عوام کے دلوں سے ہمارا احترام اُٹھ جائے گا ۔

حکومت کی حمایت میں خاموش تماشائی بن کر ہم کب تک عوام اور ان کی خواہشات کو نظر انداز کریں گے ۔ اس سے خود فوج کے اندر بھی اختلافات پیدا ہونے لگیں گے ۔ پہلے ہی چار بریگیڈیر حضرات اس مسئلہ پر فوج کو چھوڑ کر جا چکے ہیں ۔ ایک کپتان نے اپنے افسروں کا حکم ماننے سے انکار کر دیا ہے اور یہ سب کچھ لاہور میں ہوا ہے ۔ دسویں ڈویژن کے ان افسروں نے عوام کے خلاف کارروائی میں حصہ لینے سے انکار کرکے ہمیں ایک نئی صورتِ حال سے دوچار کر دیا ہے ۔ ریٹائرڈ افسران کے حلقوں میں بھی ریفرنڈم کو بہ نظرِ استحسان نہیں دیکھا جا رہا ۔ اس موقع پر ہمیں چاہیئے کہ درمیان میں پڑ کر دونوں متحارب قوتوں کو پُرامن بقائے باہمی کے کسی سمجھوتہ پر مجبور کریں ورنہ معاملات شاید کسی کے قابو میں بھی نہ رہیں ۔"

جنرل جہانزیب ارباب کے بعد لاہور کی چوتھی کور کے کمانڈر جنرل محمد اقبال خان نے اپنے مؤقف کا اظہار کرتے ہوئے کہا :

"بلاشبہ ہم ایک انتہائی مشکل مرحلہ سے گزر رہے ہیں ۔ اب تو وکیل بھی اس حکومت کے خلاف ہو چکے اور اُنہوں نے قومی اتحاد والوں کو مشورے دینا شروع کر دیئے ہیں ۔ یہ ایک خطرناک بات ہے اس لئے ہمیں درمیان میں پڑ کر مسئلہ حل کرانا چاہیئے ، ایک اور اہم بات یہ ہے کہ اب عورتوں اور بچوں نے بھی حکومت کے خلاف جلوس نکالنا شروع کر دیئے ہیں ۔ میں نے تو اپنے افسروں سے کہہ دیا ہے کہ ان پر ہرگز ہرگز گولی نہ چلائی جائے ۔ مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے جوانوں میں اس غیر یقینی صورتِ حال پر زبردست اضطراب پایا جا رہا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ ریفرنڈم کا بائیکاٹ ہوگا اور صورتِ حالات صوبائی انتخابات سے مختلف نہیں ہوگی جب تمام پولنگ سٹیشن ویران پڑے تھے ۔ اپنے اخبارات سے عوام کا اعتماد اُٹھ چُکا ہے اور اب وہ خبروں کے لیے بی بی سی سے رجوع کرنے لگے ہیں ۔"

اس موقع پر ارباب جہانزیب نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ "سندھ میں صورتِ حالات کے مزید خراب ہونے کا امکان ہے ۔ کیونکہ ممتاز بھٹو اور ایک دوسرے وفاقی وزیر مسٹر کٹپٹر سندھی اور غیر سندھی کے درمیان نفرت کے بیج بونے میں مصروف ہیں ۔ پیرپگارا کی نظربندی کے بھی منفی اثرات مرتب ہوں گے ۔"

اب صوبہ سرحد کی گیارھویں کور کے کمانڈر جنرل سوار خان کی باری تھی ۔ اُنہوں نے کہا :

"سرحد میں قومی اتحاد والے جیت گئے تھے اس لئے وہاں کوئی بڑا مسئلہ پیدا نہیں ہوا ۔ لیکن اب وہاں بھی پُرامن جلسے جلوسوں کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے ۔ حالات عام طور پر پُرامن ہیں مگر مصیبت کسی بھی وقت آ سکتی ہے ۔ افسران کا رویہ ٹھیک ہے مگر وہ صورتِ حال سے تنگ آئے ہوئے ہیں ۔ صوبائی حکومتیں غیر مؤثر ہو چکی ہیں کیونکہ عوام ان کے ساتھ نہیں رہے ۔ عوام میں یہ تأثر پیدا ہو رہا ہے کہ فوج غیر معمولی تاخیر اور تکلف سے کام لے رہی ہے ۔ ہمیں حکومت کو بتا دینا چاہیئے کہ دوبارہ انتخابات ہی صورتِ حالات کا واحد حل ہیں ۔"

دسویں کور کے کمانڈر جنرل چشتی کے زیرِ نگیں علاقہ میں چونکہ آزاد کشمیر بھی شامل تھا ، اس لئے انہوں نے اسی حوالے سے بات شروع کی ۔ انہوں نے کہا :

"آزاد کشمیر میں فوجی ایکشن کے اثرات انتہائی شدید ہوں گے ۔ ہمیں آزاد کشمیر کو اس معاملہ سے باہر ہی رکھنا چاہیئے ۔ لانگ مارچ اس لئے ناکام نہیں ہوا کہ قومی اتحاد والوں نے کوشش نہیں کی ، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ میں نے اُنہیں اس کی اجازت نہیں دی ۔ فوج بلاشبہ اسوقت ملک کی اعلیٰ ترین (سپریم) اتھارٹی ہے ۔ مگر اصل مسئلہ ازسرِنو انتخابات ہیں ۔ ہم کسی ذہنی وابستگی (کنوکشن) کے بغیر لڑ رہے ہیں ۔ ہمیں یہ بات کُھل کر کہنی چاہیئے کہ دھاندلی ہوئی ہے اور اسے ساری دنیا نے دیکھا ہے ۔ موجودہ قومی اسمبلی ایک مکمل غیر آئینی ادارہ ہے جس کی کوئی حیثیت نہیں ۔ دسویں ڈویژن میں جو کچھ ہوا ہے اس سے سب کی آنکھیں کُھل جانی چاہئیں اور یہ ریفرنڈم کیا ہے ؟ اصل مسئلہ یہ نہیں کہ وزیرِاعظم رہیں یا نہ رہیں ، اصل مسئلہ یہ ہے کہ پیپلز پارٹی رہے یا نہ رہے ۔ اگر موجودہ وزیرِاعظم ہی موجود رہے تو وہ ایک جماعتی حکومت اور صدارتی نظام لے آئیں گے جس پر قومی اتحاد کی تحریک مزید بڑھے گی ۔ عوام کو حکومت پر یکسر اعتماد نہیں رہا ۔ وہ چاہتے ہیں کہ فوج آگے بڑھ کر ازسرِنو انتخابات کے لئے زور دے ۔"

منگلا کی پہلی کور کے کمانڈر جنرل غلام حسن خان نے نسبتاً دھیمے لہجے میں کہا :

"میں آپ سب سے اتفاق کرتا ہوں کہ اس وقت ملک شدید بحران میں ہے اور اسے حل کرنے کے لئے زبردست اقدامات کی ضرورت ہے ۔ ریفرنڈم اس بحران کا حل نہیں ۔ یوں بھی پارلیمانی نظام میں ریفرنڈم کسی شخصیت کے بارے میں نہیں ، پارٹی کے بارے میں کرایا جاتا ہے ۔ میرا علاقہ پُرامن ہے ۔ صرف سیالکوٹ ، گوجرانوالہ اور فیصل آباد میں تھوڑی بہت گڑبڑ ہوئی ہے ۔ میرے جوانوں اور افسروں نے بھی کوئی غلط قدم نہیں اُٹھایا ، مگر وہ پریشان ضرور ہیں ۔ انہیں بیرونی خطرات سے ڈرانے کا سلسلہ دراز تر ہوتا چلا جا رہا ہے ۔ ادھر لوگ کہتے ہیں کہ دھاندلی ہوئی ہے ۔ انتخابات دوبارہ ہونے چاہئیں ۔"

ملتان کی دوسری کور کے کمانڈر جنرل غلام محمد نے کہا :

"ملتان میں اب تک سینتیس افراد مارے جا چکے ہیں اور ان میں ایف ایس ایف کے دو وابستگان بھی شامل تھے ۔ پہیہ جام ہڑتال بہت کامیاب رہی ۔ گرنیڈ ، بم اور بوتل بم عام استعمال ہو رہے ہیں ۔ اس تحریک کی جڑیں عوام میں بہت گہری ہیں ۔ وہ دوبارہ انتخابات مانگ رہے ہیں ۔ سویلین حکومت کو صورتِ حالات پر کوئی قابو نہیں رہا ۔ مذہبی دیوانے سرکاری املاک اور اہم شخصیات کو نقصان پہنچانے کی تبلیغ میں مصروف ہیں ۔ پیپلز پارٹی عملی طور پر ختم ہو چکی ہے ۔ اس سے وابستہ افراد راتوں رات وفاداریاں تبدیل کرکے اسے چھوڑتے جا رہے ہیں ۔ ملتان میں عمومی صورتِ حالات بہت خراب ہے ۔ پنجابی اور غیر پنجابی کا جھگڑا فوج کو بھی متاثر کرے گا ۔ تحریک چونکہ زیادہ تر شہروں میں ہے ۔ اس لئے حکومت کو شہریوں کے اطمینان پر توجہ دینی چاہیئے ۔ ریفرنڈم موجودہ حالات کا علاج نہیں ، بلکہ اس سے صورتِ حال مزید خراب ہوگی ۔ انتخابات دوبارہ ہونے چاہئیں اور فوج کو اس معاملہ میں پڑ کر مسائل کا کوئی حل پیش کرنا چاہیئے ۔

تمام کورکمانڈر حضرات بول چکے تو چیف آف آرمی سٹاف جنرل محمد ضیاءالحق کی باری آئی ، انہوں نے واضح الفاظ میں کہا :

" فوج اس صورتِ حال میں تیسری پارٹی نہیں ہے ۔ قومی اتحاد کا جو ڈیزائن آپ دیکھ رہے ہیں ، یہ اُس سے کہیں زیادہ گہرا اور پیچیدہ معاملہ ہے ۔"

اس کے بعد اُنہوں نے انٹر سروسز انٹیلی جنس کے سربراہ کی طرف اشارہ کیا جنہوں نے شرکاء اجلاس کو بتایا کہ :

"عوام میں اخبارات کا اعتبار ختم ہو چُکا ہے ۔ فوج پر اعتماد بھی کم ہو رہا ہے ۔ غیر ملکی مداخلت کا خطرہ ہے ۔ مگر ہماری سرحدوں پر گڑ بڑ کے ظاہری آثار موجود نہیں ہیں ۔"

.....○.....

مارشل لاء کیسے لگا؟

۱۶ – مئی کے اس اجلاس کی تفصیلی روداد سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قومی اتحاد کی تحریک سے خود فوج کے حلقوں میں تشویش و اضطراب کی کیفیت کیا تھی ۔ مگر جنرل ضیاءالحق جب بھی بھٹو صاحب سے ملتے ، انہیں یہی یقین دلاتے کہ فوج پوری طرح آپ کے ساتھ ہے ، انہی دنوں مسلح افواج کے بڑوں کا ایک مشترکہ اعلامیہ بھی اخبارات میں شائع کروایا گیا جس میں انہوں نے مکمل طور پر پیپلز پارٹی کی آئینی حکومت کا ساتھ دینے کے "مستحکم مؤقف" کا اعادہ کیا تھا ۔ خود جنرل ضیاءالحق بھی جب بھٹو صاحب سے ملتے تو آخر میں سینے پر ہاتھ رکھ کر اپنے مخصوص منکسرانہ انداز میں مسکراتے ہوئے یہ ضرور کہتے ،

Sir I will support you to the hilt.

(جناب میں کاملاً آپ کا ساتھ دوں گا)

بھٹو صاحب ان کی یہ بات سُن کر مطمئن ہو جاتے ۔ جنرل ضیاءالحق پر ان کے اعتماد کی وجہ صرف جنرل صاحب کی یہ یقین دہانیاں ہی نہیں تھیں ، بلکہ بھٹو صاحب اس لیے بھی مطمئن تھے کہ اُنہوں نے جنرل ضیاء الحق کو آٹھ سینیئر جرنیلوں کو بالائے طاق رکھ کر ترقی دی تھی ۔ وہ دو باتوں کے بارے میں کامل طور پہ پُریقین تھے ، ایک تو یہ کہ جنرل ضیاءالحق ان کے اپنے آدمی ہیں ، دوسرے یہ کہ فوج میں ڈسپلن کا پورا خیال رکھا جاتا ہے اور جنرل ضیاءالحق بہرحال فوج کے سربراہ ہیں ، مگر ایک بار جب جنرل صاحب نے بھٹو صاحب کے سامنے نادانستہ طور پر اپنی کمزوری کا اعتراف کر لیا تو بھٹو صاحب نے بھی اپنی رائے تبدیل کر لی ۔ ہوا یوں کہ ایک روز دورانِ گفتگو جنرل صاحب کے منہ سے کہیں یہ جُملہ بھی پھسل گیا کہ "جناب وزیراعظم! میرے بعض ساتھی جرنیل آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں ۔ بہتر ہو گا کہ آپ اُنہیں بھی بُلا کر مطمئن کر دیں تاکہ موجودہ حالات میں فوجی (Option) کے استعمال کا امکان ہی باقی نہ رہے ۔"

جنرل ضیاءالحق کی اس بات سے بھٹو صاحب چونک گئے ، اُنہوں نے جب اس بات پر دوبارہ غور کیا تو دو باتیں بالکل واضح نظر آنے لگیں ایک تو یہ کہ جرنیل حضرات فوجی (Option) کے بارے میں بھی سوچنے لگے ہیں ۔ دوسرے یہ کہ جنرل ضیاءالحق فوج کے تنہا نمائندے نہیں بلکہ اُنہیں باقی لوگوں کو بھی اعتماد میں لے کر ہاتھ میں رکھنا ہو گا ۔

اس واقعہ کے بعد بھٹو صاحب نے جنرل ضیاءالحق کو مشورہ کے لیے بُلانا چھوڑ دیا ، اگر کہیں ضرورت محسوس کرتے تو تمام کور کمانڈروں کو بُلا کر بات کر لیتے ۔ اس صورتِ حال سے جنرل ضیاء الحق ظاہر ہے کہ تشویش میں مبتلا ہو گئے ۔ وہ خود جس مرتبہ پر فائز تھے ، چونکہ یہ خالصتاً بھٹو صاحب کی صوابدید کا کرشمہ تھا ، اس لیے انہیں دھڑکا لگ گیا کہ بھٹو صاحب کہیں کوئی اور فیصلہ نہ کر لیں ، یہ فیصلہ کسی نئے چیف آف سٹاف کی تعیناتی کا بھی ہو سکتا تھا جو ظاہر ہے کہ بھٹو صاحب کے آئینی اختیارات کا حصہ تھا ۔ اور اس حوالے سے بھٹو صاحب کے ملٹری سیکرٹری جنرل امتیاز کا نام بھی لیا جانے لگا تھا ۔

ادھر بعض کور کمانڈروں نے بھی اپنے سربراہ پر دباؤ بڑھانا شروع کیا ، کہ وہ اس مشکل قومی مرحلہ میں اپنا کردار ادا کریں ۔ جنرل ضیاءالحق نے اس حوالے سے مختلف کور کمانڈروں کے ساتھ تنہا تنہا بات کی ۔ جنرل عارف تب اُن کے معتمد ترین رفیق تھے ، اُنہوں نے بھی اس حوالے سے اہم کردار ادا کیا ، اور آخر کار فیصلہ یہ ہوا کہ کسی مناسب وقت پر اس حوالے سے کسی اقدام پر غور کیا جائے گا ۔ لیکن ان مباحث کے ذریعہ جنرل ضیاء الحق کو ایک بات کا اندازہ ہو گیا اور وہ یہ کہ بھٹو صاحب کے خلاف کسی اقدام کی صورت میں کور کمانڈروں کی اکثریت ان کے ساتھ ہو گی ۔ تاہم انہوں نے اس معاملہ کو حتی المقدور خفیہ رکھا ۔ خاص طور سے وقت کے بارے میں تو کسی کو بھی خبر نہ ہونے دی ۔ جنرل جمال سید میاں ۲ – جولائی کی رات لندن سے واپس آئے اور چار جولائی کی صُبح ان کی جنرل ضیاءالحق سے ملاقات ہوئی ، جس میں تازہ صورتِ حالات پر تبادلۂ خیال بھی ہوا ۔ جنرل جمال سید میاں کے بقول ، جنرل ضیاء الحق نے اُنہیں کہا :

"اب تو معاملات کافی حد تک درست ہو چکے ہیں ، مذاکرات کے تازہ سلسلہ سے صورتِ حالات کافی بہتر ہوئی ہے اور حالات درست ہونے کے امکانات روشن ہو گئے ہیں ۔"

مگر اسی شب ، فلیش مین ہوٹل میں ایک دوست کے ساتھ کھانا کھانے کے بعد جب انہوں نے رات گیارہ بجے کے قریب گھر آ کر کپڑے تبدیل کر لیے اور سونے کے لیے لیٹے تو سرہانے رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی جھنجھنا اُٹھی ، فون اُٹھایا تو دوسری طرف چیف آف سٹاف کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈیر خاور لطیف لائن پر تھے ۔ انہوں نے جنرل صاحب کو فوری طور پر "چیف" کے دفتر پہنچنے کے لیے کہا ، جنرل صاحب نے بتایا کہ وہ تو اپنی گاڑی بھی رخصت کر چکے ہیں ۔ بریگیڈیر خاور لطیف نے جواب دیا ، "جناب آپ کپڑے تبدیل کر کے باہر نکلیں ، گاڑی آپ کے دروازے پر موجود ہو گی ۔"

جب بھٹو نے ریفرنڈم کرانے کا اعلان کیا ۔۔ قومی اسمبلی ہال ۔ ۱۳ ۔ مئی ۱۹۷۷ء

اور واقعی ، جب وہ باہر نکلے تو گاڑی دروازے پر موجود تھی ۔ جی ایچ کیو پہنچے تو کانفرنس روم میں تمام پرنسپل سٹاف افسران ، سگنل انچیف اور جی ایچ کیو کے سینیئر جرنیل ، ڈائریکٹر ملٹری انٹیلی جنس سمیت موجود تھے ۔ تھوڑی دیر میں جنرل چشتی بھی آگئے ۔ معلوم ہوا کہ ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا ہے ۔ پرنسپل سٹاف افسروں کو چونکہ وہیں پہنچ کر اس صورتِ حال کا علم ہوا تھا ، اس لیے ایک افسر نے بے تابی سے بعض عملی قسم کے سوال کرنا شروع کیے ۔ مگر جنرل چشتی نے پورے اعتماد سے مسکراتے ہوئے کہا :

Don,t worry. Every thing has been taken care of.

(فکر نہ کرو ۔ ان تمام معاملات پر پوری توجہ صرف کی جا چکی ہے) ۔

ذرا سی دیر میں خود ذوالفقار علی بھٹو ، سابق وزیراعظم پاکستان کا فون آگیا ، جنہیں جنرل ضیاءالحق نے بہ نفس نفیس مارشل لاء لگانے کے فیصلہ سے آگاہ کیا ، بھٹو صاحب نے جواباً انہیں بتایا کہ اُن کی بیٹی صنم بھٹو آج ہی طویل سفر کے بعد راولپنڈی پہنچی ہیں ، اور سخت تھکن کے باعث سوئی ہوئی ہیں ۔ اس لیے اُنہیں آج کی رات ایوانِ وزیراعظم ہی میں رہنے کی اجازت دے دی جائے ۔"

"کیوں نہیں ، سر ، کیوں نہیں آپ آرام فرمائیں ۔ فکر کی کوئی بات نہیں" جنرل ضیاء الحق نے اپنی روایتی منکسرالمزاجی سے جواب دیا ۔

اور یوں بھٹو صاحب کو ایوانِ وزیراعظم میں اپنی آخری رات گزارنے کی اجازت مل گئی ۔

اگلی صُبح پونے دس بجے اُنہیں ایک فوجی طیارے میں مری روانہ کر دیا گیا ۔

اس موقع پر ایک پرنسپل سٹاف افسر کو پھر کُچھ خیال آیا اور اُنہوں نے اس خدشہ کا اظہار کیا کہ بھٹو صاحب کہیں ضروری کاغذات وغیرہ تلف نہ کر دیں ، مگر جنرل چشتی نے ایک بار پھر پورے اعتماد سے مسکراتے ہوئے کہا :

"آپ فکر نہ کریں ، سب کُچھ ٹھیک ہو چُکا ہے ۔"

تب جنرل ضیاءالحق کو مسلّح افواج کے دوسرے سربراہوں اور جائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین ، جنرل شریف کا خیال آیا اور اُنہوں نے ٹیلی فون پر انہیں اس فیصلہ کی اطلاع دی ، جس پر عمل درآمد بھی تقریباً مکمل ہو چُکا تھا ۔ جنرل شریف نے کہا کہ یہ افسوسناک صورتِ حال میں ایک افسوسناک فیصلہ ہے ، مگر میں اس پر کُچھ بھی کہنے سے گریز کروں گا ۔ ایئر چیف مارشل ذوالفقار علی خان تنہیا گلی میں تھے ، اُنہیں وہاں اس فیصلہ کی اطلاع دی گئی جب کہ ایڈمرل شریف کو اس وقت بتانے کی ضرورت محسوس

امریکی خط کا شاخسانہ ۔۔ راولپنڈی صدر ۳۰ ۔ اپریل ۱۹۷۷ء

نہیں کی گئی ۔ کیونکہ وہ پہلے ہی سے "باخبر" تھے ۔

ملک میں مارشل لاء نافذ کرنے کے باوجود جنرل ضیاءالحق اسے "مارشل لاء" کا نام دینے سے گریزاں تھے ۔ ۴ – جولائی کی رات جی ایچ کیو میں جمع ہونے والے جرنیلوں کے درمیان بھی اس موضوع پر کافی بحث ہوئی ۔ جنرل ضیاءالحق اور اُن کے ہمنواؤں کی اکثریت اس مارشل لاء کو "عارضی انتظام"، "عارضی نظام برائے انتخابات" یا "انتظام برائے انتخابات" کا نام دینے کی حامی تھی ۔ جنرل جمال سید میاں کچھ دیر تو اپنے ساتھیوں کی یہ تجاویز سنتے رہے، پھر اُنہوں نے جنرل ضیاءالحق کو مخاطب کرتے ہوئے کہا :

"سر! پشتو میں ایک کہاوت ہے کہ آپ گھوڑے پر سواری بھی کرنا چاہتے ہیں مگر اُس پر بوجھ ڈالنے سے گریز کر رہے ہیں ۔ کچھ یہی صورتِ حال یہاں درپیش ہے ۔ ہم لوگ جو بھی کہیں، مگر واقعہ یہی ہے کہ ملک میں مارشل لاء نافذ ہُو چکا ہے ۔ بہتر یہ ہے کہ اسے مارشل لاء ہی کا نام دیا جائے، ورنہ اس سے بعض مزید پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی ۔" جنرل ضیاءالحق نے جواب دیا، "آپ ٹھیک کہتے ہیں، مگر میری خواہش یہ ہے کہ ہم پر آئین شکنی کا الزام نہ آئے ۔ جو مارشل لاء کی صورت میں آ سکتا ہے ۔"

اس موضوع پر تھوڑی سی بحث کے بعد طے یہ پایا کہ چیف جسٹس یعقوب علی خان کو بُلا کر اُن کی رائے لی جائے کہ وہ کیا کہتے ہیں ۔ چند ہی لمحوں میں جسٹس صاحب کو بھی بُلا لیا گیا ۔ اُنہوں نے یہ مشورہ دیا کہ آئین کو توڑنے کی بجائے عارضی طور پر معطل کر دیا جائے ۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد سیکرٹری اطّلاعات مسعود نبی نور سے کہا گیا کہ وہ ملک میں مارشل لاء کے نفاذ کی خبر فوری طور پر اخبارات اور ریڈیو ٹی وی وغیرہ کو جاری کر دیں ۔ اس وقت رات کا تقریباً ڈیڑھ بجا تھا ۔ مسعود نبی نور نے کہہ دیا کہ اخبارات تو شائع ہو چکے ہوں گے ۔ البتہ اُنہوں نے صُبح پانچ بجے کی ریڈیو خبروں میں یہ اعلان کروا دینے کی ہامی بھر لی ۔ صُبح پانچ بجے تک تمام جرنیل جی ایچ کیو میں بیٹھے خبروں کا انتظار کرتے رہے مگر جب خبریں آئیں تو اُن میں اس خبر کا دور دور تک پتہ نہیں تھا ۔ بلکہ ان میں رات گئے تک بھٹو اور پی این اے کے درمیان جاری رہنے والے مذاکرات کی خبر نمایاں کی گئی تھی ۔ ان خبروں کو سن کر جرنیل حضرات سخت طیش میں آئے ۔ بعد میں صوبائی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹروں نے مسعود نبی نور کے خلاف کارروائی کا مشورہ دیا ۔ وہ کچھ عرصہ زیرِ عتاب بھی رہے، مگر آہستہ آہستہ اُنہوں نے اپنی سابقہ پوزیشن بحال کر لی ۔

.....○.....

سیاستدانوں کی کہہ مکرنیاں

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاءالحق جو نوے روز کے اندر انتخابات کرانے کے وعدے پر ۴ – جولائی ۱۹۷۷ء کی شب برسرِ اقتدار آئے تھے، اُنہوں نے ۸ – اگست ۱۹۷۷ء کی صُبح ایک الیکشن سیل قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ جنرل چشتی اس سیل کے سربراہ بنے ۔ جب کہ اس کے اراکین میں جنرل راؤ فرمان علی، جنرل جمال سید میاں اور جنرل احسان الحق ملک شامل تھے ۔ ۲۱ – اگست کی صُبح دس بج کر پچاس منٹ پر اس سیل نے پہلے سیاسی رہنما سے ملاقات کی، یہ ملاقات چکلالہ میں واقع جنرل چشتی کے دفتر میں ہوئی ۔ ملاقات کرنے والے رہنما کا نام محمد یوسف خان خٹک تھا اور وہ خان عبدالقیوم خان کے نمبر دو کی حیثیت میں مسلم لیگ قیوم گروپ کی نمائندگی کرنے تشریف لائے تھے ۔ قومی اتحاد کے اس رہنما نے فوج کے الیکشن سیل کو خبر دی کہ این ڈی پی اور جمعیت العلماء اسلام نے اگر انتخابات میں حصہ لیا تو صوبہ سرحد میں صرف انہی کی حکومت بنے گی اور مسلم لیگ کو ایک بھی نشست حاصل نہیں ہو سکے گی ۔ کیونکہ مسلم لیگ کو تو قومی اتحاد والے بھی کوئی نشست نہیں دے رہے ۔ اُنہوں نے الیکشن سیل کے جرنیلوں سے کہا کہ وہ اس سلسلہ میں کوئی "کردار" ادا کریں ۔ سیل کے ایک جرنیل نے اُنہیں آگاہ کیا کہ اس صورت میں قومی اتحاد ٹوٹ جائے گا تو جناب یوسف خٹک نے جواب دیا کہ ایسی صورت میں مسلم لیگ، جماعت اسلامی اور تحریک استقلال ایک طرف ہو کر این ڈی پی اور جمعیت العلماء اسلام کا مقابلہ کر سکتی ہیں ۔

یوسف خٹک صاحب اپنی بات کہہ کر چلے گئے تو الیکشن سیل کے ایک جرنیل نے ہنستے ہوئے، دوسرے سے کہا :

"یہ صاحب صرف اپنا الیکشن جیتنے کے چکر میں ہیں ۔"

یوسف خٹک کے فوراً بعد الیکشن سیل سے ملاقات کے لیے آنے والے سیاسی رہنما کا نام غلام مصطفیٰ کھر تھا ، انہوں نے ملفوف انداز میں یہ تاثر دیا کہ اگر کسی طرح پیپلز پارٹی کو الیکشن کے بائیکاٹ پر

مجبور کر دیا جائے تو پارٹی میں موجود دائیں بازو کے عناصر ان کی اور غلام مصطفیٰ جتوئی کی قیادت میں ایک نسبتاً قابلِ قبول گروپ بنا کر بہتر کردار ادا کرنے کے لئے تیار ہیں ۔ انہوں نے الیکشن سیل کے اراکین کے سامنے تجویز پیش کی کہ اگر وہ چاہیں تو ان کی ملاقات غلام مصطفیٰ جتوئی سے بھی کرائی جا سکتی ہے ۔ سیل کے اراکین نے حامی بھر لی اور ۲۵ - اگست کو کھر صاحب غلام مصطفیٰ جتوئی سمیت دوبارہ ان سے ملنے آئے ۔ یہ ملاقات بھی جنرل چشتی کے دفتر میں ہوئی اور اس ملاقات کے دوران ان دونوں اہم قومی رہنماؤں نے یہ تجویز پیش کی کہ الیکشن سیل پیپلزپارٹی اور قومی اتحاد کی تمام جماعتوں پر مشتمل ایک "ایک گرینڈ" اجلاس طلب کر کے ، یہ بات ابھی سے طے کروالے کہ آئندہ سے پاکستان میں بھی ٹرکی کی طرح فوج کا ایک مستقل آئینی کردار ہو گا اور وہ یہ کہ کسی بھی گڑبڑ کی صورت میں فوج آئینی طور پر اقتدار پر قبضہ کر سکے گی ۔ غلام مصطفیٰ جتوئی نے سیل کے اراکین کو مشورہ دیا کہ وہ پیپلزپارٹی کے صرف انہی لیڈرانِ کرام کو طلب کریں جن پر انہیں پورا اعتماد ہو ۔ کیونکہ اکیلے بھٹو صاحب پر کسی بھی صورت میں اعتبار نہیں کیا جا سکتا ، وہ اگر اکیلے آئے بھی تو ناقابلِ اعتبار ہوں گے ۔ غلام مصطفیٰ جتوئی نے بے بسی کے انداز میں کہا ، "جناب! جب تک بھٹو موجود ہے ، ہم اسے نہیں چھوڑ سکتے ، اس سے ہمارے بارے میں عوامی تأثر مجروح ہو گا ۔ تاہم اگر اسے منظر سے ہٹا دیا جائے تو کھر صاحب اور میں دونوں مل کر پیپلز پارٹی میں موجود دائیں بازو کے عناصر سمیت ، پوری قوت سے آپ کا ساتھ دیں گے ۔" اپنا یہ موقف بیان کرنے کے بعد جتوئی صاحب کھر کو اکیلے اندر چھوڑ کر باہر چلے گئے ۔ کھر صاحب نے کہا ، " جناب! ہمیں بھٹو کو "آؤٹ" کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے ، اس کے بعد ہماری پیپلزپارٹی ، این ڈی پی ، جمعیت العلماء اسلام اور مسلم لیگ کا اتحاد ہو سکتا ہے جس میں تحریک استقلال بھی شامل ہو سکتی ہے ۔ اس اتحاد کی مدد سے جتوئی کو وزیراعظم بنا کر آپ معاملات کو بہتر طریقہ سے چلا سکتے ہیں ۔"

اٹھتے اٹھتے ، کھر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا ، "اور اگر ایسا ہو جائے تو مجھے ملک سے باہر جانے کی اجازت دے دیجئے گا ۔"

۲۳ - اگست کو الیکشن سیل نے بعض دیگر سیاسی لیڈروں سے ملاقاتیں کیں ۔ یہ ملاقاتیں جنرل راؤ فرمان علی کے فوجی فاؤنڈیشن والے دفتر میں ہوئیں ۔ اس روز ملاقاتیں کرنے والے تین رہنماؤں پروفیسر عبدالغفور احمد ، ایس ایم ظفر اور ائیر مارشل اصغر خان میں سے پہلے ، ائیر مارشل ہی تھے ۔ انہوں نے سیل کے کارپردازوں کو قومی اتحاد کے بارے میں اپنے مؤقف سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک مصنوعی (Artificial) اتحاد ہے ، جو عملی طور پر قائم نہیں رہ سکتا ، اور اگر فوج اسے ایک اتحاد ہی کے طور پر چلانا اور کامیاب کروانا چاہتی ہے تو اسے ایک نئے مارشل لاء کے لیے بھی تیاری مکمل رکھنی چاہیئے ۔ یہ اتحاد بھٹو کو نکالنے کی حد تک تو ٹھیک تھا مگر اس کے بعد اس کی افادیت نہ ہونے کے برابر ہے ۔ اب حالت یہ ہے کہ اس اتحاد کی نشستیں کوٹا کی بناء پر تقسیم کی جا رہی ہیں ۔ اور تقسیم کی بنیاد محض یہ ہے کہ کس علاقہ میں

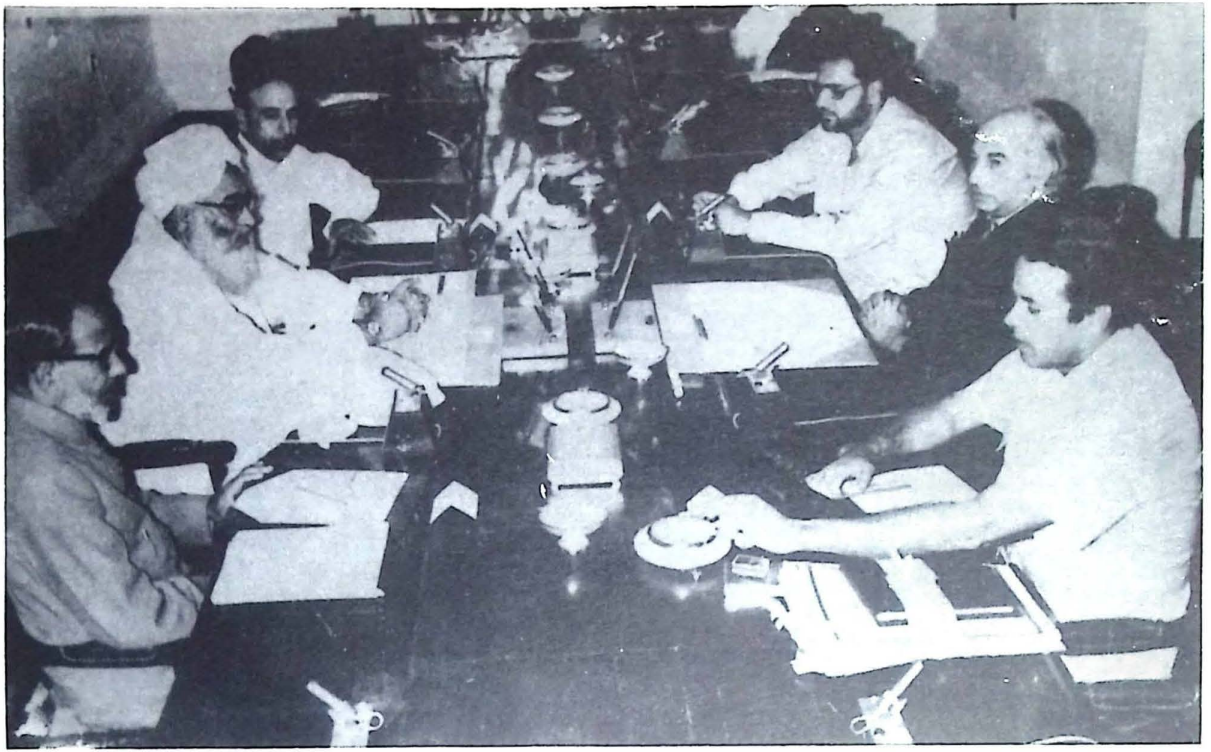

مذاکرات جو مارشل لاء تک لے گئے ۔۔ قومی اتحاد کے رہنما نوابزادہ نصراللہ خان، مولانا مفتی محمود، پروفیسر عبدالغفور احمد، پیپلز پارٹی کے وزیراعظم بھٹو، مولانا کوثر نیازی اور عبدالحفیظ پیرزادہ سے مذاکرات میں مصروف ہیں ۔۔ ایوان وزیراعظم ۔۔ ۱۲ ۔ جون ۱۹۷۷ء

کس جماعت کا زور زیادہ ہے ۔ اگر یہ اتحاد قائم رہا تو اس کی نمائندگی مختلف علاقائی تنظیموں کی صورت میں سامنے آئے گی اور یہ ایک ایسا رجحان ہے ، جس کی بہرحال حوصلہ شکنی ہونی چاہئیے ۔ تحریکِ استقلال کسی دوسری جماعت میں مدغم ہونا نہیں چاہتی ۔ ہم ہر حال میں اپنا تشخص برقرار رکھیں گے اور کسی بھی قیمت پر مُلّاؤں کی جماعت نہیں بنیں گے ۔ قومی اتحاد کے لیڈروں کو تو نظامِ مصطفیٰ کے معانی کا بھی صحیح طور پر علم نہیں ۔ ان کا مبلغ علم محض ہاتھ کاٹنے اور سنگسار کرنے تک محدود ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ عوام نے ان کے اس نام نہاد "نظامِ مصطفیٰ" سے ڈرنا شروع کر دیا ہے ۔ ادھر آپ لوگوں کا احوال یہ ہے کہ آپ (مارشل لاء والے) بھی عوام کو نظامِ مصطفیٰ ہی کا نام لے لے کے ڈرا رہے ہیں اور ملک کا پڑھا لکھا طبقہ ہراساں ہے کہ اگر مذہبی جنونیوں کا یہ گروہ واقعی برسرِاقتدار آگیا تو کیا ہو گا ۔"

قومی اتحاد کے بارے میں اپنے نظریات بیان کرنے کے بعد ائیر مارشل صاحب نے نوے دن کے اندر انتخابات کرانے کے فیصلہ پر شدید تنقید کی ۔ انہوں نے کہا :

"آخر آپ کے یہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر صاحب نوے روز کے اندر انتخابات کرانے پر کیوں اڑے ہوئے ہیں ۔ شاید انہیں بیرونِ ملک اپنا شخصی تاثر قائم کرنے کی فکر ہے ۔ میں کہتا ہوں اکتوبر میں الیکشن پر اپنی سوئی اڑانے کی بجائے بہتر یہ ہے کہ آپ لوگ اپنی سہولت کے مطابق ایک (Flexible) تاریخ دیں، آپ کو بیرونِ ملک اپنا شخصی وقار بڑھانے کی بجائے اندرونِ ملک کے حالات پر توجہ دینی چاہئیے، پہلے تاریخ ملتوی کریں، پھر ایسے حالات پیدا کریں جن میں پیپلزپارٹی بائیکاٹ پر مجبور ہو جائے ۔ اس کے بعد جماعتی بنیادوں پر انتخابات کے لیے از سرِنو کاغذات نامزدگی طلب کر لیں ۔ اس طرح قومی اتحاد بھی ٹوٹ جائے گا اور الیکشن کے نتائج حسبِ دلخواہ بھی ہوں گے ۔ لیکن اگر آپ نے موجودہ حالات ہی کے مطابق اکتوبر میں الیکشن کرانے پر زور دیا تو حکومت علاقائی جماعتوں کے ہاتھ میں چلی جائے گی اور قومی جماعتیں منہ دیکھتی رہ جائیں گی ۔ اس صورت میں تشکیل پانے والی اسمبلی اپوزیشن سے بھی یکسر محروم ہو گی ۔ یہ ایک افسوسناک منظرنامہ ہو گا، جس سے بچنے کے لیے آپ کو ابھی سے منصوبہ بندی شروع کرنی چاہئیے ۔۔۔۔ اور اگر آپ کا ارادہ پیپلزپارٹی کو بائیکاٹ پر مجبور کرنے کا ہو تو مجھے بتائیے، تاکہ میں ابھی سے تیاری شروع کر دوں گا ۔"

ائیر مارشل صاحب کا تیسرا اور آخری نکتہ ذوالفقار علی بھٹو کی ذات اور ان کے مستقبل سے متعلق تھا ۔ انہوں نے کہا :

"بھٹو اور ان کے ساتھی قتل ، بددیانتی اور دوسرے بہت سے جرائم میں ملوث ہیں، ان کا ابھی سے احتساب ہونا چاہئیے ۔ آپ اس معاملہ کو آئندہ حکومت پر مت چھوڑیں ۔ ہم اخلاقی مجرموں کو اپنا لیڈر تسلیم نہیں کر سکتے ۔ آپ نے بھٹو کو گرفتار کیا ہے تو اس پر مضبوط مقدمہ بھی بنائیں اگر آپ نے ایسا

چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاءالحق، اپنے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بننے کا اعلان کر رہے ہیں -- راولپنڈی ۵ - جولائی ۱۹۷۷ء

نہ کیا تو یہ گویا قومی ذمہ داریوں سے فرار ہو گا ۔ بھٹو کی گرفتاری کے خلاف ردّعمل کی پروا نہ کریں، البتہ پیپلزپارٹی کے غنڈوں پر کڑی نگاہ رکھیں ۔ اگر قومی اتحاد اپنا موجودہ انتخابی نشان (ہل) چھوڑ دے تو اسے کسی ایک سیاسی جماعت کے حوالے مت کریں ۔"

ائیر مارشل کے بعد ایس ایم ظفر الیکشن سیل کے اراکین سے ملنے آئے ۔ انہوں نے سیل کو مشورہ دیا کہ تمام اعتماد سے محروم (Discredited) سیاسی لیڈروں پر ایبڈو کی پابندی عائد کر کے انہیں الیکشن میں حصہ لینے کی اہلیت سے محروم کر دیں ۔ اس عمل میں صرف پانچ ہفتے صرف ہوں گے ۔ مارشل لاء حکومت کا فرض ہے کہ وہ اقتدار کسی مضبوط جماعت کے حوالے کرے ۔ جہاں تک بھٹو کے خلاف مقدمات کا تعلق ہے تو موجودہ مقدمات سے اسے ختم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان میں اس کے خلاف کافی گواہیاں موجود نہیں ۔ اگر آپ نے موجودہ حالات میں انتخابات کروا دیئے تو سندھ اور بلوچستان میں مرکز اور دوسرے صوبوں کی یکسر مخالف قوتیں برسرِ اقتدار آ جائیں گی، جس کے بعد چھ ماہ کے اندر آپ لوگوں کو دوبارہ مارشل لاء نافذ کرنا پڑے گا ۔ بھٹو کے خلاف جس طرح کی کارروائیوں میں آپ لوگ مصروف ہیں ۔ اس سے ان کی مقبولیت میں اضافہ ہو گا ۔ جہاں تک قومی اتحاد کا تعلق ہے ، اس کی جماعتیں محض بھٹو کے خوف سے اکٹھی ہیں ، ورنہ ان کے درمیان کوئی قدرِ مشترک نہیں ۔"

ایس ایم ظفر کے بعد اس روز ملاقات کرنے والے لیڈروں میں سے آخری یعنی پروفیسر عبدالغفور احمد آئے اور سیل کے اراکین سے ملاقات کی ۔ انہوں نے پہلے تو اپنے حلقہ کے بعض ووٹروں کے مسائل بیان کیے جس کے بعد انہوں نے سیل کے جرنیلوں کو بتایا کہ تحریک استقلال نے عملی طور پر قومی اتحاد سے عدم تعاون شروع کر رکھا ہے ۔ ائیر مارشل اصغر خان اجلاسوں میں نہیں آتے، تحریک کے امیدوار اتحاد کے امیدواروں کے مقابل کھڑے ہیں اور کاغذات واپس نہیں لے رہے ۔ اس سے قومی اتحاد کمزور ہو گا اور بھٹو صاحب کی یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ یہ اتحاد زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا ۔

اس کے بعد پروفیسر صاحب نے الیکشن سیل کو آگاہ کیا کہ مارشل لاء حکومت بھٹو صاحب کو سیاسی طور پر دوبارہ زندہ کر رہی ہے ۔ ہم نے انہیں سیاسی طور پر مار دیا تھا مگر آپ اس مردہ میں حیاتِ نو پھونک رہے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ آج پیپلز پارٹی والے تو مارشل لاء کے خلاف کام اور باتیں کر کے عوام میں اپنا مقام بنا رہے ہیں اور ہم قومی اتحاد والے مارشل لاء کی حمایت میں مصروف رہ کر اپنے سیاسی قدوقامت کو کم تر کرنے میں مصروف ہیں ۔ اور ابھی تو بھٹو صاحب کا منشور آنا باقی ہے، جانے وہ اس میں عوام کو کس انداز کی راہِ عمل پیش کریں ۔"

.....○.....

بھٹو کی گرفتاری کا پس منظر

الیکشن سیل کے ارکان نے سیاستدانوں کے ساتھ اپنی ان ملاقاتوں کی تفصیل چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاءالحق کے گوش گزار کی تو اُنہوں نے ذوالفقارعلی بھٹو کے بارے میں ان سیاستدانوں کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اس امر کا اشارہ دیا کہ بھٹو کے خلاف کچھ نہ کچھ کاروائی ضرور ہونی چاہئیے ۔ جنرل ضیاءالحق کی اس معاملہ میں عجیب کیفیت تھی ۔ بھٹو نے اُنہیں آٹھ جرنیلوں کو پس پشت ڈال کر چیف آف آرمی سٹاف بنایا تھا ۔ یہ لازماً ایک بڑا احسان تھا جس کے بعد بھٹو صاحب کی دانست میں کم از کم جنرل ضیاء کو ان کی حکومت برطرف نہیں کرنا چاہیئے تھی اور شاید یہی تأثر تھا جس کا اظہار انہوں نے مارشل لاء لگنے کے بعد جنرل ضیاءالحق سے اپنی پہلی ملاقات میں کیا ۔ یہ ملاقات مری میں ہوئی اور اس ملاقات کے دوران بھٹو صاحب نے بالکل غیر سیاسی رویہ اختیار کرتے ہوئے جنرل ضیاء کو سخت سست سنائیں ۔ جس کے بعد جنرل ضیاءالحق نے اپنے طور پر یہ اندازہ قائم کر لیا کہ بھٹو کو اگر موقع مل گیا تو وہ انہیں کسی قیمت پر معاف نہیں کریں گے ۔ ماضی میں ایسی لاتعداد مثالیں موجود تھیں کہ بھٹو جس سے ناراض ہوئے ، مصیبتوں نے اُس کا گھر دیکھ لیا ۔ سو جنرل ضیاءالحق نے بڑی آہستگی اور نرمی مگر مستقل مزاجی کے ساتھ بھٹو کے دشمنوں سے معاملت کرنا شروع کر دی ۔ جنرل صاحب کو یہ اندازہ بھی تھا کہ اُنہوں نے مارشل لاء ایسے وقت میں لگایا جب دونوں متحارب قوتوں کے درمیان مذاکرات تقریباً کامیاب ہو چکے تھے ۔ یہ کہنا غلط ہو گا کہ جنرل صاحب نے مارشل لاء لگانے کا فیصلہ ۴ – جولائی ہی کو کیا ۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ اس فیصلہ پر بہت پہلے پہنچ چکے تھے اور یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے اپنا لندن کا دورہ منسوخ کر کے اپنی جگہ جنرل جمال سید میاں کو بھجوا دیا ۔ حالانکہ انہی دنوں ان کی چہیتی بیٹی زین ضیاء کا لندن میں دل کا آپریشن ہو رہا تھا ۔ اور وہ اس آپریشن کے دوران اپنی بیٹی کے پاس رہ سکتے تھے ۔ مگر اُنہوں نے لندن جانے کی بجائے پاکستان ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا ۔ جنرل صاحب جانتے تھے کہ بھٹو جیسا ذہین شخص آہستہ آہستہ ان سب باتوں کو سمجھ جائے گا ۔ پھر یہ تلخ حقیقت بھی اپنی جگہ تھی کہ جنرل صاحب آخر وقت تک

بھٹو صاحب کو اپنے "مکمل تعاون" کی یقین دہانیاں کراتے رہے تھے ۔ تب اُن کی حالت یہ ہوا کرتی تھی کہ بھٹو کے احترام میں آرام دہ صوفہ پر بھی ایسے تن کر بیٹھتے جیسے بھٹو کوئی بہت بڑے روحانی پیشوا ہوں ۔ مارچ ۱۹۷۶ء میں جب بھٹو ملتان گئے تو جنرل صاحب نے فوجی افسروں کے بچوں اور بچیوں سے اُن پر گلپاشی کروائی تھی ۔ یہ چونکہ ایک غیر معمولی بات تھی ، اس لئے فوج کے اعلیٰ ترین حلقوں میں اسے سخت ناپسند کیا گیا تھا ۔ مگر اس واقعہ کے چند ہی روز بعد اُنہیں چیف آف آرمی سٹاف مقرر کر دیا گیا ۔

اگست ۱۹۷۶ء میں جب فارمیشن کمانڈروں کا اجلاس ہوا تو حسبِ دستور ایک روز وزیراعظم جی ایچ کیو کے مہمان تھے ، جب کہ دوسرے روز فوجی جرنیل وزیراعظم کے مہمان بنے ۔ پہلے روز اس اجلاس میں یہ بات بھی زیرِ بحث آئی کہ فوجی میسوں میں شراب کی ممانعت ختم کر دی جائے ۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس تجویز کے محرک خود جنرل محمد ضیاء الحق تھے جنہوں نے چیف آف آرمی سٹاف بنتے ہی "ایمان، تقویٰ، جہاد فی سبیل اللہ" کو فوج کا ماٹو بنا دیا تھا ۔ فوجی میسوں میں شراب کی ممانعت کا حکم جنرل ٹکا خان کے دور میں دیا گیا اور اس کی وجہ مولانا مفتی محمود مرحوم بنے جو اس وقت صوبہ سرحد کے وزیراعلیٰ تھے ۔ انہوں نے جب سرکاری دعوتوں میں شراب پیش کئے جانے پر پابندی عائد کی تو ساتھ ہی بھٹو صاحب کو یہ خط بھی لکھا کہ اب صرف فوجی میسوں میں شراب پیش کی جاتی ہے جس سے بہرحال الجھنیں جنم لیں گی ۔ بھٹو صاحب نے یہ خط جنرل ٹکا خان کو بھجوا دیا جو اُس وقت چیف آف آرمی سٹاف تھے ۔ انہوں نے فوری طور پر یہ حکم جاری کر دیا کہ آئندہ فوجی میسوں میں بھی شراب پیش نہیں کی جائے گی ۔ جنرل ضیاءالحق چیف بنے تو ان کے بعض رفقاء نے انہیں بتایا کہ نوجوان فوجی افسروں کی زندگی میں واحد تفریح یہی ہوتی ہے کہ وہ سرِشام ذرا سے "مسرور" ہو لیں ۔ اب جبکہ یہ تفریح بھی باقی نہیں رہی، نوجوان افسران بعض دیگر اخلاقی خرابیوں کا شکار ہونے لگے ہیں ۔ جنرل صاحب نے یہ معاملہ فارمیشن کمانڈروں کے اجلاس میں پیش کیا ۔ جس کی بعض دوسرے جرنیلوں نے شدید مخالفت کی ۔ پہلے روز اس معاملہ پر بحث جب طویل ہو گئی تو جنرل ضیاءالحق نے یہ کہتے ہوئے اسے اگلے روز تک کے لیے مؤخر کر دیا کہ Let us sleep over it for a night.

شام کو بھٹو صاحب حسبِ روایت جنرل صاحب کے مہمان تھے، اس موقع پر موجود تمام جرنیل یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ چیف آف آرمی سٹاف کے حکم پر نہ صرف بھٹو صاحب، بلکہ دیگر مہمانوں کو بھی شراب پیش کی گئی ۔ اس پر بھٹو صاحب کے قریب بیٹھے ہوئے ایک جرنیل نے مسکراتے ہوئے کہا،

"سر! آپ کے قدم بہت مبارک ہیں کہ آپ کی وجہ سے ہماری تشنہ لبی ختم کرنے کا سلسلہ بھی بحال ہو گیا ہے ۔"

اس پر ایک زبردست قہقہہ پڑا ۔ اور بھٹو نے اپنی مخصوص شراب کا ایک جام ان جرنیل صاحب کو پیش کرنے کا اشارہ کیا ۔ مگر اس کارروائی کے باوجود اگلے روز کمانڈروں کی اکثریت نے فوجی میسوں

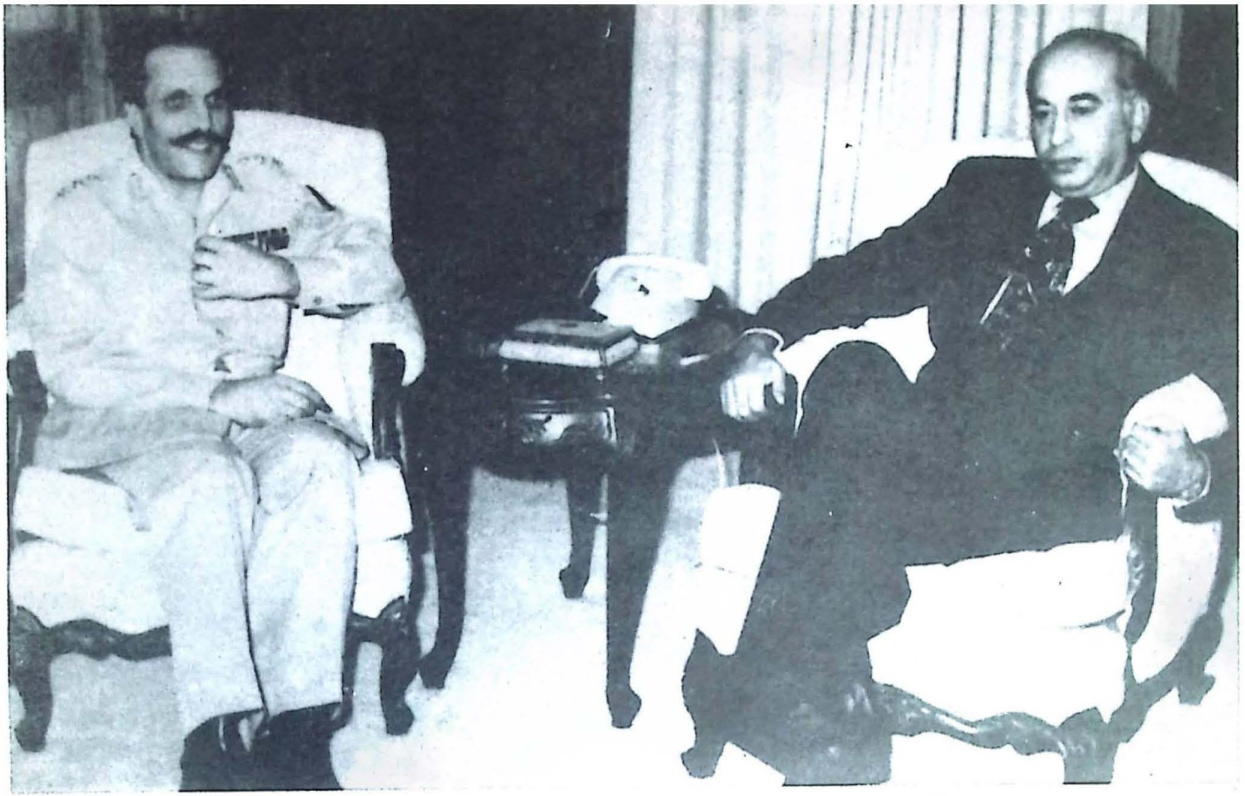

جنرل ضیاءالحق اور ذوالفقار علی بھٹو ۔۔ مری میں حفاظتی نظر بندوں سے ملاقات ۔۔ ۱۵ ۔ جولائی ۱۹۷۷ء

میں شراب دوبارہ شروع کرنے کی اجازت دینے سے انکار دیا ۔

چونکہ جنرل ضیاءالحق وزیراعظم بھٹو کو خوش کرنے کے لیے بہت دور تک جاتے رہے تھے ، اس لیے بھٹو کو اقتدار سے اتارنے کے بعد انہوں نے لاشعوری طور پر بھٹو سے انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا، اور جب قومی رہنماؤں نے بھی ان کے دل کی بات کہنا شروع کی تو گویا انہیں ایک رسمی بہانہ بھی ہاتھ آ گیا ، انہوں نے جنرل چشتی، راؤ فرمان علی اور جنرل کے ۔ ایم ۔ عارف کو ہدایت کی کہ وہ بھٹو کے خلاف مقدمات تلاش کریں ۔ اس سلسلہ میں آئی ۔ ایس ۔ آئی کے ڈائریکٹر جنرل کو بھی ان سے تعاون کی ہدایت کر دی گئی ۔ ۳۰ – اگست ۱۹۷۷ء کو ایف ۔ آئی ۔ اے ۔ کے ڈائریکٹر جنرل نے الیکشن سیل کے اراکین سے ملاقاتیں کیں اور انہیں بتایا کہ بھٹو کے خلاف مقدمات میں ناکافی گواہیوں کے باعث ماتحت عدالتیں ان کی گرفتاری کے احکام جاری کرنے سے ہچکچا رہی ہیں، تاہم انہوں نے بھٹو کے خلاف مختلف مقدمات کی تفصیل سیل کے حوالے کر دی، اگلے روز (۳۱ – اگست کو) شام چار بجے سیل کے اراکین چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاءالحق سے ملے اور یہ بات اصولی طور پر طے کر لی گئی کہ بھٹو کو ۴ – ستمبر سے پہلے پہلے گرفتار کر لیا جائے گا ۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے بھٹو کو ایک پرانے مقدمۂ قتل میں گرفتار کرنے کی ہدایت کی ۔ اور تین ستمبر کی صبح ساڑھے چار بجے ایف آئی اے نے کراچی میں بھٹو کی اقامت گاہ ۷۰ کلفٹن سے انہیں گرفتار کر کے پاکستان ائیر فورس کے ایک خصوصی طیارے پر لاہور پہنچا دیا ۔ جہاں انہیں توپ خانہ کے میس میں رکھا گیا ۔ پیپلزپارٹی کے جیالے کارکنوں میں سے ایک بھی اس گرفتاری کے خلاف احتجاج کے لیے نہیں نکلا کیونکہ اس بات کا یقین پہلے ہی سے حاصل کر لیا گیا تھا کہ بھٹو کی گرفتاری پر کوئی ردّعمل ظاہر نہ ہونے پائے ۔ اور واقعہ یہ ہے کہ بھٹو کی گرفتاری کے ٹھیک دو گھنٹے بعد غلام مصطفیٰ جتوئی اور کھر کراچی سے اسلام آباد کے لیے روانہ ہو چکے تھے ۔ جہاں انہوں نے اسی روز صبح دس بجے الیکشن سیل کے اراکین سے ملاقاتیں کیں اور اپنی یقین دہانیوں کا اعادہ کیا کہ وہ معاملات کو ہاتھ سے نہیں نکلنے دیں گے ۔

.....○.....

انتخابات ملتوی کرانے والے

بھٹو کی اس گرفتاری سے قبل مارشل لاء کے الیکشن سیل نے مختلف سیاسی رہنماؤں سے ملاقاتیں کر کے اس امر کی تسلّی کر لی تھی کہ گرفتاری پر کوئی خاص ردّعمل نہیں ہونے دیا جائے گا ۔ ۳۰ – اگست کی صبح گیارہ بجے ایف ۔ آئی ۔ اے کے ڈائریکٹر جنرل سے ملاقات اور بھٹو کے خلاف موجود مقدمات کا جائزہ لینے کے فوراً بعد سیل کے اراکین نے جماعت اسلامی کے میاں طفیل محمد سے ملاقات کی ۔ نصف گھنٹہ کی اس ملاقات کے دوران میاں صاحب نے کوئی خاص بات نہیں کی ۔ مگر ساڑھے بارہ بجے ملنے والے سیاسی رہنما ایوب کھوڑو نے یقین دلایا کہ بھٹو کو گرفتار کر لیا جائے تو اس فیصلہ کے خلاف سندھ میں کوئی ردّعمل نہیں ہو گا، البتہ اندرونِ پنجاب میں اس نوعیت کی کوئی بات ضرور ہو سکتی ہے کیونکہ بھٹو اور ان کی پارٹی روپیہ پانی کی طرح بہاتی رہی ہے ۔ کھوڑو صاحب نے دعویٰ کیا کہ بھٹو صاحب سندھ میں صرف جتوئی کے حلقہ سے الیکشن جیت سکتے ہیں، اس کے علاوہ وہاں پر ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے ۔ انہوں نے الیکشن سے پہلے احتساب کا مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ مارشل لاء حکام کو بددیانت افراد سے قوم کی گلو خلاصی کرانی چاہیئے ۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ممتاز بھٹو واحد شخصیت ہیں جو سندھ میں ایجی ٹیشن کرا سکتے ہیں ۔ عبدالحفیظ پیرزادہ کے بارے میں استفسار کیا گیا تو انہوں نے بتایا کہ سندھ میں پیرزادہ صاحب کی کوئی سیاسی حیثیت نہیں ۔

اس روز ڈیڑھ بجے غلام مصطفیٰ کھر نے سیل کے اراکین سے ملاقات کر کے انہیں ایک بار پھر یہ یقین دلایا کہ بھٹو کے گرفتار ہو جانے کی صورت میں وہ اور جتوئی مل کر معاملات کو سنبھال لیں گے ۔

۳۱ – اگست کو اصغر خان نے بھی ایک بار پھر سیل کے اراکین سے ملاقات کر کے انہیں یقین دلایا کہ بھٹو کی گرفتاری پر کوئی قابلِ ذکر ردّعمل نہیں ہو گا ۔ انہوں نے انتخابات مارچ ۱۹۷۸ء تک ملتوی کرنے کا مشورہ بھی دیا ۔ یکم ستمبر کو چودھری ظہور الٰہی مرحوم نے سیل کے اراکین سے ملاقات کی اور مشورہ دیا کہ

بھٹو کو فوراً گرفتار کر لیا جائے ۔ انہوں نے انتخابی امیدواروں سے اثاثوں کے گوشوارے طلب کرنے کی تجویز بھی پیش کی ۔

۴ ۔ ستمبر کی صبح بھٹو کی گرفتاری کے بعد سب سے پہلے توکھر اور جتوئی نے الیکشن سیل کے اراکین سے ملاقات کی ۔ ان کے بعد چودھری ظہور الٰہی آئے اور سیل کے اراکین کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے اثاثوں کے گوشواروں والی تجویز چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تک پہنچا دی اور جنرل ضیاءالحق نے اپنی یکم ستمبر کی پریس کانفرنس میں اس فیصلہ کا اعلان بھی کر دیا کہ تمام انتخابی امیدواروں کو اپنے اثاثوں کے گوشوارے پیش کرنا ہوں گے ۔ چودھری صاحب نے صوبہ سرحد میں این ڈی پی اور جمعیت العلماء اسلام کے اثر و نفوذ پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس سے ملک کو نقصان پہنچے گا ۔ چودھری صاحب کی اس بات سے سیل کے پٹھان رُکن جنرل جمال سید میاں غصے میں آ گئے ۔ انہوں نے کہا، آپ پنجاب والے دوسرے تمام صوبوں کے نمائندوں کو غدار قرار دینا بند کریں ۔ بعد میں انہوں نے اپنے ساتھیوں کو الگ بھی یہ مشورہ دیا کہ وہ صوبہ سرحد کے عوامی نمائندوں سے بات چیت کریں تاکہ غلط فہمیاں پھیلانے والوں کو اپنا کھیل کھیلنے کا موقع نہ مل سکے ۔

۵ ۔ ستمبر کو امیر عبداللہ روکڑی سیل کے اراکین سے ملنے آئے تو انہوں نے بھی این ڈی پی اور جمعیت العلماء اسلام کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کیا اور تجویز پیش کی کہ صوبہ سرحد میں ان دونوں جماعتوں کی راہ روکی جائے ورنہ وہاں بھی مشرقی پاکستان جیسے حالات پیدا ہو جائیں گے اور بعض ہمسایہ ممالک اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پختونستان کے قیام کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کریں گے ۔ انہوں نے یہاں تک کہا کہ اس صوبہ میں مسلم لیگ کو کامیاب کرانے کے لیے اگر الیکشن ملتوی کرنا پڑیں تو اس سے بھی گریز نہیں کیا جانا چاہیئے ۔

۶ ۔ ستمبر کو انٹیلی جنس بیورو کے ڈائریکٹر جنرل محمود علی چودھری نے سیل کے اراکین سے ملاقات کی، اس موقع پر انٹر سروسز انٹیلی جنس کے سربراہ جنرل غلام جیلانی خان بھی موجود تھے ۔ بیورو کے سربراہ نے الیکشن سیل کو امن و امان کی تازہ ترین صورتِ حالات سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ اگر کھلی سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دی گئی تو ملک میں زبردست خون خرابا ہو گا ۔ خاص طور سے پنجاب کے حالات بہت بگڑ جائیں گے ۔ انہوں نے بتایا کہ پیپلزپارٹی کے پاس کافی اسلحہ ہے جسے اگر استعمال کرنے دیا گیا تو نتیجہ لازمی تباہی کی صورت میں برآمد ہو گا ۔ انہوں نے بھٹو دور میں قائم ہونے والی فیڈرل سیکورٹی فورس (ایف ۔ ایس ۔ ایف) پر فوری پابندی عائد کر کے اسے پولیس میں مدغم کرنے کی تجویز پیش کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ باہمی یگانگت کو فروغ دینے کے لیے فوج اور پولیس کے افسران کو زیادہ سے زیادہ اکٹھے نظر آنا چاہیئے تاکہ نچلی سطح پر بھی دونوں شعبوں میں تعاون کی راہ ہموار ہو سکے ۔ انہوں نے بعض سیاسی جماعتوں کے بارے میں بتایا کہ انہیں غیر ملکی امداد ملتی ہے ۔ انٹیلی جنس بیورو کے سربراہ یہ تفصیلات

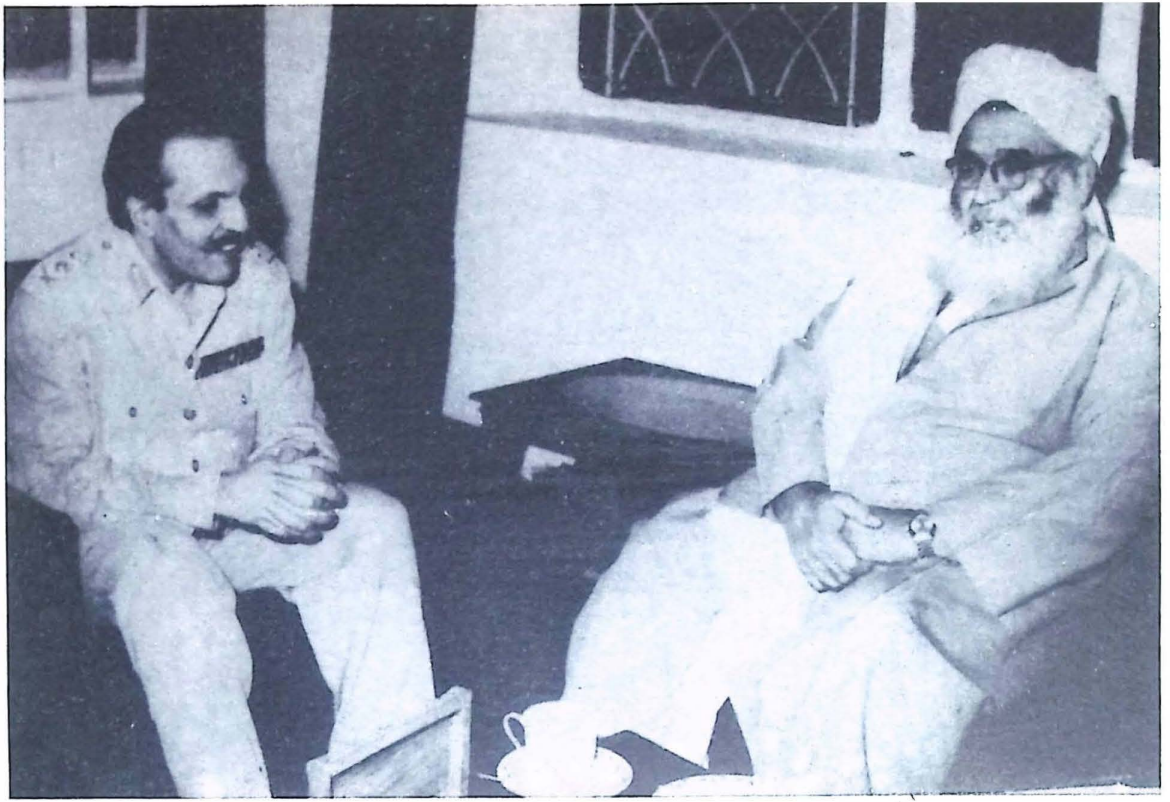

جنرل ضیاءالحق اور مولانا مفتی محمود ۔۔ مری میں حفاظتی نظر بندوں سے ملاقات ۔۔ ۱۵ ۔ جولائی ۱۹۷۷ء

بیان کر کے چلے گئے تو سیل کے اراکین کا ایک خصوصی اجلاس ہوا جس میں صورتِ حالات پر تفصیلی تبادلۂ خیالات کے بعد یہ بات نوٹ کی گئی کہ اگر غلام مصطفیٰ کھر اور جتوئی پیپلز پارٹی کی طرف سے بائیکاٹ کے باوجود انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کر دیں تو بیگم نصرت بھٹو اکیلی کوئی بڑا مسئلہ پیدا نہیں کر سکیں گی ۔ اس اجلاس کے بعد چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے رابطہ قائم کر کے انہیں تجویز پیش کی گئی کہ وہ تمام سیاستدانوں کی ایک مشترکہ کانفرنس طلب کریں ۔ طے ہوا کہ یہ کانفرنس ۱۲ ۔ ستمبر کو ہو گی ۔

۱۲ ۔ ستمبر کی صبح گیارہ بجے ملک کے تقریباً تمام سیاستدان جی ایچ کیو کے لیکچر ہال میں جمع تھے ۔ قومی اتحاد کی نمائندگی مولانا مفتی محمود ، مولانا شاہ احمد نورانی، خان محمد اشرف خان اور پروفیسر عبدالغفور احمد نے کی جب کہ پیپلز پارٹی کی جانب سے بیگم نصرت بھٹو، عبدالحفیظ پیرزادہ، مولانا کوثر نیازی اور ڈاکٹر غلام حسین موجود تھے ۔ ان کے علاوہ اٹھارہ ایسی سیاسی جماعتوں کو بھی دعوت دی گئی تھی جن میں سے اکثر کا وجود "ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے" کی تصویر و تفسیر تھا ۔ دیگر قابلِ ذکر سیاستدانوں میں سے خان عبدالقیوم خان اور شیرباز مزاری بھی کانفرنس میں موجود تھے ۔

اس اجلاس میں زیادہ تر گفتگو آئندہ انتخابات کے ضوابط اور طریقِ کار پر ہوئی ۔ قومی اتحاد کے رہنماؤں نے اکثر و بیشتر مقامی نوعیت کے مسائل و معاملات پر زورِ بیان صرف کیا ۔ اس کے برعکس پیپلزپارٹی کے نمائندے پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے، مسز بھٹو نے کہا کہ ہمارے کارکن جیلوں میں نظر بند ہیں ۔ جب تک انہیں رہا نہیں کیا جاتا، انتخابات غیر جانبدارانہ اور منصفانہ ہو ہی نہیں سکتے ۔ عبدالحفیظ پیرزادہ نے کہا کہ آپ انتخابی ضوابط کا مسوّدہ تیار کر کے ہمیں مطالعہ کے لیے دے دیں تاکہ ہم اس کی خواندگی مکمل کر کے اپنی تجاویز پیش کر سکیں ۔ انہوں نے اطلاعات و ابلاغ کے شعبوں میں بھی سب کے لیے قابلِ قبول ضابطۂ اخلاق پر عمل درآمد کی تجویز پیش کی ۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ بھی کہا کہ چونکہ ۱۸ ۔ اکتوبر سے ملک میں انتخابی عمل کا آغاز ہو جائے گا ۔ لہٰذا اس تاریخ کے بعد سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کی گرفتاریوں کا سلسلہ روک دیا جانا چاہیئے ۔ کیونکہ اگر لیڈروں کو اپنے حلقوں ہی میں نہ جانے دیا گیا تو انتخابات منصفانہ کیسے کہلا سکیں گے ۔ انہوں نے اثاثوں کے گوشواروں کی تیاری کے لیے وقت کی کمی کی طرف توجہ دلانے کے علاوہ یہ مطالبہ بھی کیا کہ ریڈیو اور ٹی وی پر تمام سیاسی جماعتوں کو ان کے امیدواروں کی تعداد کے حساب سے وقت دیا جائے ۔

کانفرنس کے عین درمیان میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے اے ڈی سی دبے پاؤں اندر آئے اور کاغذ کا ایک پرزہ جنرل ضیاء الحق کے ہاتھ میں تھما دیا ۔ اس پرزے پر یہ اطلاع مندرج تھی کہ لاہور کی ایک عدالت نے ذوالفقار علی بھٹو کی درخواست برائے ضمانت منظور کر لی ہے ۔

کانفرنس ختم ہوئی تو اس "بری خبر" کے علاوہ انتخابات ملتوی کرنے کی تجاویز کا جائزہ لینے کے لیے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی زیرِ صدارت ایک اجلاس ہوا ۔ سیل کے بعض اراکین نے مارچ تک

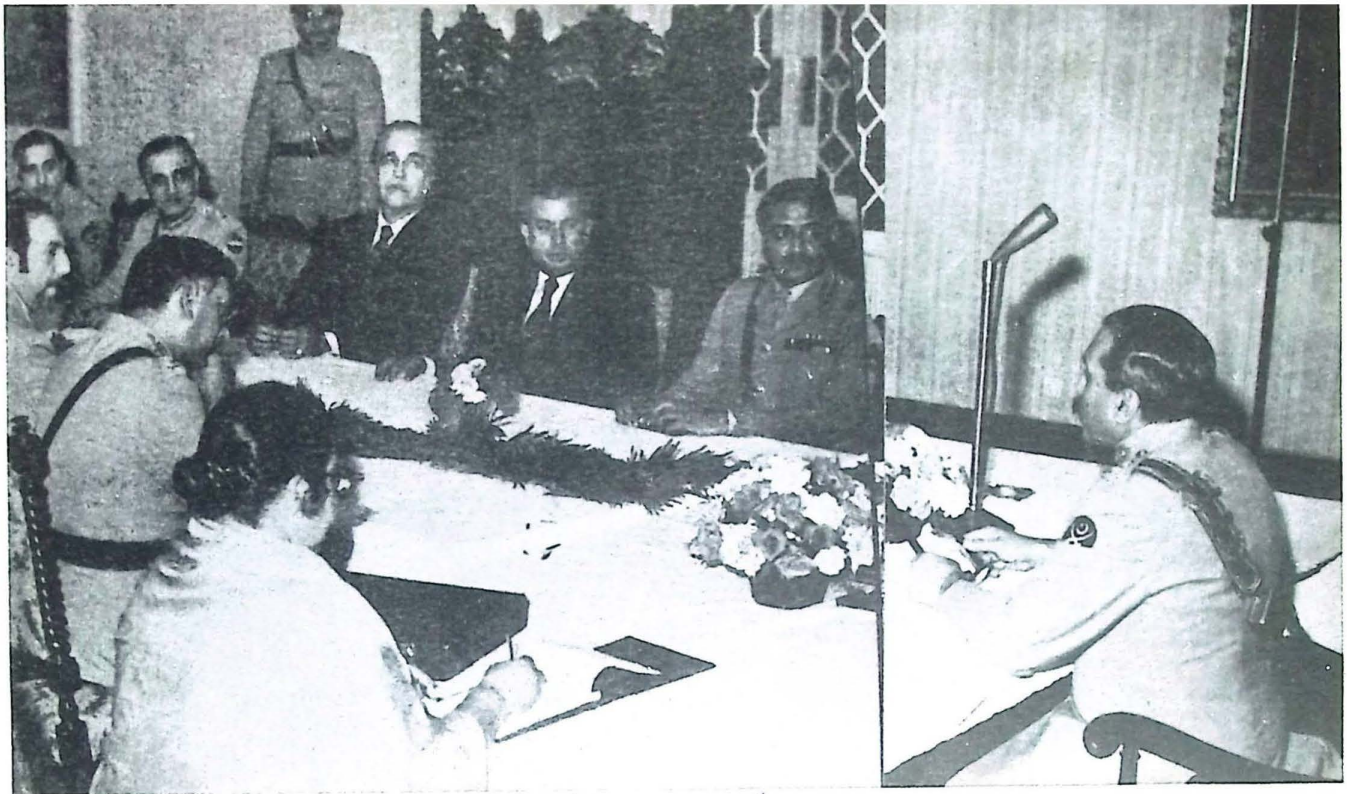

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی کابینہ، جس میں مسلم لیگ بھی شامل تھی ۔

انتخابات ملتوی کرنے کی تجویز پیش کی، مگر جنرل ضیاءالحق نے اسے سختی سے مسترد کرتے ہوئے کہا کہ انتخابات زیادہ سے زیادہ چار ہفتوں کے لیے ملتوی کیے جا سکتے ہیں ۔

.....○.....

اور الیکشن ملتوی ہو گیا

۱۲ ۔ ستمبر کو بھٹو کی ضمانت پر رہائی چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاءالحق اور ان کے رفقاء کو سخت ناگوار گزری ۔ تب جنرل اقبال لاہور کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے ۔ انہیں اس بات پر جنرل ضیاء کے باقاعدہ عتاب کا سامنا کرنا پڑا کہ انہوں نے بھٹو کو رہا کیسے ہونے دیا ۔ اگر عدالت نے انہیں رہا کر ہی دیا تو کوٹ لکھپت جیل سے نکلتے ہی وہ کسی اور مقدمہ میں گرفتار کیوں نہ کر لیے گئے ۔ جنرل اقبال طبعاً دوسرے مزاج کے آدمی تھے ۔ انہوں نے صاف جواب دیتے ہوئے کہا کہ جناب، میرے پاس بھٹو کے خلاف اور کوئی الزام موجود ہی نہیں تھا ۔ جنرل اقبال کے اس مؤقف سے یہ تأثر لیا گیا کہ وہ اندر خانہ، دلی طور پر بھٹو کے حامی ہیں ۔ اس بات کی تصدیق کے لیے انہیں حکم دیا گیا کہ بھٹو کو ملتان میں جلسہ سے قبل گرفتار کر لیا جائے ۔ جنرل اقبال اس حکم کو بھی بہ لطائف الحیل ٹال گئے اور یوں جنرل ضیاء الحق کا یہ شک یقین میں تبدیل ہو گیا کہ جنرل اقبال بھٹو کے خلاف کوئی سخت اقدام کرنے سے گریزاں ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ لاہور میں بھٹو کے مقدمہ کی سماعت اور راولپنڈی میں انہیں پھانسی چڑھانے کے وقت جنرل اقبال پنجاب کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نہیں رہے اور ان کی جگہ جنرل سوار خان کو بھیج دیا گیا ۔ بہت بعد میں جب بھٹو کی پھانسی پر رحم کی اپیل کا معاملہ در پیش ہوا اور جنرل ضیاء الحق نے اپنے ان رفقاء سے صلاح مشورہ کیا تو بھی جنرل اقبال نے یہی مشورہ دیا تھا کہ اپیل کے معاملہ کو آئندہ منتخب حکومت کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے ۔

جنرل اقبال کی اس نرم روی کے باعث بھٹو ملتان میں ایک عوامی جلسہ منعقد کرنے کے بعد کراچی پہنچے اور وہاں بھی جلسہ کا اعلان کر دیا ۔ ۱۷ ۔ ستمبر کو انہیں مارشل لاء کے ضابطہ ۱۲ کے تحت نظربند کر دیا گیا ۔ یہ گویا ان کی آخری نظربندی تھی جو ان کی موت تک مختلف حوالوں سے قید میں تبدیل ہوتی رہی اور اس بار وہ قید ہوئے تو مر کر ہی چھوٹ پائے ۔

۲۶ – ستمبر ۱۹۷۷ء کو جنرل ضیاءالحق نے اپنے رفقاء کا ایک اجلاس طلب کر کے انہیں بتایا کہ روس میں پاکستانی سفیر اور پاکستان میں روسی سفیر، دونوں کے ذریعہ حکومتِ روس نے یہ پیغام بھیجا ہے کہ روس موجودہ حالات میں خاموش تماشائی نہیں رہے گا ۔ اسی اثناء میں یاسرعرفات نے بھی اپنے "بھائی" بھٹو کی رہائی کا مطالبہ کر دیا ۔ اندریں حالات جنرل صاحب کے رفقاء نے یہ مشورہ دیا کہ معاملات کو صحیح نہج پر چلانے کے لیے انتخابات مارچ ۱۹۷۸ء تک ملتوی کر دیئے جائیں اور ملک کو ٹوٹنے سے بچایا جائے ۔ دراصل اس وقت تک جنرل ضیاء کے "رفقاء" بھی دو حصوں میں تقسیم ہو چکے تھے ۔ ایک وہ جو واقعی ان کے رازدان تھے اور دوسرے وہ جنہیں ان کے عہدہ کی وجہ سے مجبوراً بلایا جاتا تھا ۔ ایسے موقعوں پر جنرل صاحب اور ان کے رازدانوں کا طریقۂ کار یہ ہوتا کہ ان میں سے کوئی ایک معاملہ کو بڑھا چڑھا کر اس انداز میں پیش کرتا کہ ایک انتہائی خوفناک تصویر کھنچ کر سامنے آ جاتی ۔ اس کے بعد دوسرے صاحب اس صورتِ حال کا کوئی ایسا حل تجویز کر دیتے جس کے حق میں فیصلہ کرنا مقصود ہوتا ۔ اس روز بھی یہی ہوا ۔ جب صورتِ حالات پر بحث شروع ہوئی تو جنرل کے ۔ ایم ۔ عارف نے پُر تشویش لہجہ میں کہا کہ اس طرح تو الیکشن ملتوی کرنا پڑیں گے اور ایسی صورت میں بین الاقوامی سطح پر ہمارا "امیج" بہت خراب ہو گا ۔ اس پر جنرل فضل حق نے فوری مداخلت کرتے ہوئے کہا "جہنم میں گیا بین الاقوامی امیج ، ہمیں ملک بچانا چاہیئے کہ ہماری ذمہ داری یہی ہے ۔" ان کے اس فقرہ کو اٹھانے کا فریضہ خود چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے بہ نفسِ نفیس ادا کیا اور کہا، " چلئے الیکشن ملتوی ہو گئے، مگر یہ بتائیے کہ قوم اور سیاسی جماعتیں اس فیصلہ کا استقبال کس انداز میں کریں گی ۔" اس کا جواب ظاہر ہے کہ سب نے وہی دیا جو جنرل صاحب چاہتے تھے یعنی یہ کہ ، " جناب ! آپ فکر نہ کریں، فیصلہ کریں، باقی سب ٹھیک ہو جائے گا ۔"

اس موقع پر بعض دوربین نگاہ رکھنے والے رفقاء نے واضح طور پر یہ محسوس کر لیا کہ جنرل صاحب کا ارادہ اب نسبتاً طویل قیام کا ہے اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے انتخابات غیر معینہ مدّت کے لیے ملتوی کرنے کی صلاح دی تاکہ بار بار کی ندامت نہ ہو، جنرل صاحب نے اس تجویز پر بھی صاد کیا اور اس فیصلہ کے ٹھیک سات دن بعد یعنی ۲ – اکتوبر کو انہوں نے انتخابات غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دیئے ۔

انتخابات کے اس التواء کے بعد ایک بار پھر سیاسی لیڈروں کے ساتھ "مذاکرات" شروع ہو گئے ۔ ۱۱ – اکتوبر کی صبح ساڑھے آٹھ بجے ایک سابق وفاقی وزیر مسٹر انور عزیز چودھری سیل کے اراکین سے ملے ۔ انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ کم از کم بلدیاتی الیکشن تو کرا دیئے جائیں ۔ انہوں نے یہ انتخابات ایوب خان کی بی ڈی سسٹم کے انداز میں منعقد کرانے اور بعد میں غیرجماعتی بنیادوں پر عام انتخابات کروا دینے کا مشورہ دیا، جس میں سیاسی جماعتوں پر مکمل پابندی عائد کر دی جائے ۔ اور اس کے نتیجہ میں قائم ہونے والی اسمبلی کو سرکاری اور اپوزیشن دو پارٹیوں میں تقسیم کر دیا جائے ۔ تاکہ وہ "آئین کے تحت" ملکی نظام چلانا شروع کریں ۔

اس سے قبل ۲۰ ۔ ستمبر کو سندھ کی حُر ملیشیاء فورس پر سے بھٹو دور میں عائد شدہ پابندی ختم کر کے حروں کے روحانی پیشوا پیر صاحب پگارا کے دل میں نرم گوشہ پیدا کیا جا چکا تھا اور اب گورنر سندھ کے ذریعہ پیر صاحب اور جنرل ضیاءالحق کی براہِ راست ملاقاتیں شروع ہو چکی تھیں ۔

۲۰ ۔ ستمبر کو جس اعلیٰ سطحی اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا، اس میں جنرل اقبال نے مارشل لاء کو ایک سال تک توسیع دینے کی تجویز بھی پیش کی تھی ۔

۱۸ ۔ ستمبر کو غلام مصطفیٰ کھر، مولانا کوثر نیازی اور میر افضل خان الیکشن سیل سے ملنے آئے ۔ مولانا کوثر نیازی نے کہا کہ وہ ملک کے وسیع تر مفاد اور بہبود کے لیے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی نامزد کردہ کسی بھی جماعت سے تعاون کرنے کو تیار ہیں ۔ اس کے علاوہ فوج کو آئینی کردار بھی فراہم کیا جا سکتا ہے اور وزیراعظم بھی جنرل صاحب اپنی مرضی کا نامزد کر لیں ۔ جہاں تک بھٹو کا تعلق ہے، ہم ان پر اس وقت تک کھل کر تنقید نہیں کر سکتے، جب تک آپ انہیں Convict نہ کر دیں ۔ چونکہ ہم موجودہ نظام کے نگہبان ہیں، اس لئے ہمیں محدود انداز میں، آپ لوگوں پر تنقید کا حق بھی ملنا چاہیئے تاکہ ہمارا عوامی تاثر خراب نہ ہو، اس کے علاوہ غلام مصطفیٰ کھر کو انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت بھی دے دی جائے ۔

راؤ فرمان علی خان نے کہا کہ اصل ضرورت استحکام کی ہے ۔ اگر قومی اتحاد جیت بھی گیا تو پیپلزپارٹی واحد اکثریتی جماعت بن کر ابھرے گی ۔ میر افضل خان نے کہا بھٹو نے لاہور میں کہہ دیا ہے کہ فوج سے ان معاملات پر (جن کا ذکر مولانا کوثر نیازی نے کیا تھا) کوئی تعاون نہیں ہو سکتا ۔ سیکم بھٹو کے نظریات بھی یہی ہو سکتے ہیں، جس سے تصادم ہو گا ۔ آپ کو اس کی راہ روکنا چاہیئے ۔

مولانا کوثر نیازی نے کہا کہ اگر وہ قومی امور پر اس نوعیت کے تصادم کی راہ اپناتے ہیں تو ہم آپ کا ساتھ دیں گے ۔ مگر آپ کو قومی اتحاد سے معاملہ کرتے ہوئے محتاط رہنا ہو گا ۔ یہ لیڈرانِ کرام ذہناً اتنے بالغ نظر نہیں جتنا انہیں ہونا چاہیئے ۔ نظامِ مصطفیٰ ایک اچھا نعرہ ہے لیکن آخر میں اس کے نتائج فرقہ واریت کی صورت میں برآمد ہوں گے ۔ پاکستان کو سوشلزم اور ملّاازم دونوں کی ضرورت نہیں ۔ اگر آپ لوگ معاملات کو دانش اور فراست کے ساتھ چلائیں تو این ڈی پی کے لیڈر ولی خان سے آپ کا معاملہ طے ہو سکتا ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ وہ زیادہ سخت رویہ نہیں اپنائیں گے ۔

میر افضل خان نے کہا کہ آپ کو آخر کار این ڈی پی کو ایک بڑی پارٹی کے طور پر تسلیم کرنا ہی ہو گا ۔ بصورت دیگر وہ بھٹو کے ساتھ مل جائیں گے ۔ یہ الگ بات کہ ولی خان کے سامنے بھٹو کی شخصیت بالکل حقیر ہو کر رہ جائے گی ۔

مولانا کوثر نیازی نے سلسلۂ کلام ختم کرتے ہوئے کہا، "ہم آپ سے تعاون کی جو بات کر رہے

جنرل ضیاءالحق شروع میں ڈن ہل کے سگریٹ بھی پیا کرتے تھے ۔ تصویر میں ان کے ساتھ مسعود نبی نور بھی نظر آرہے ہیں ۔

یہ لوگ باہر نکلے تو مولانا کوثر نیازی اپنے ساتھی رہنماؤں اور ہر صوبہ سے اپنے پچیس پچیس اہم کارکنوں سمیت اندر داخل ہوئے ۔ مولانا اور ان کے ساتھی اپنی سابقہ ملاقات کے بعد بہت دفعہ الیکشن سیل کے اراکین سے ملنے آئے ۔ ایک آدھ دفعہ عبدالحفیظ پیرزادہ اور ممتاز بھٹو نے بھی ملاقاتیں کیں اور ڈاکٹر غلام حسین کو تو سیل کے اراکین سے ملاقات کے لیے باقاعدہ جیل سے بلوایا گیا ۔

۱۵ – اپریل کی ان ملاقاتوں کے بارے میں اندازے اور تخمینے قائم کرنے والے اس بات کو یقیناً نوٹ کریں گے کہ مسلم لیگ اور قومی اتحاد کے رہنماؤں نے مل کر بھی اتنا وقت نہیں لیا جتنا مولانا کوثر نیازی اور ان کے ہمراہیوں نے لیا ۔ پیپلزپارٹی کے نام پر ملاقات کرنے والے ان رہنماؤں کی چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے ملاقات بارہ بجکر تیس منٹ پر شروع ہوئی اور تین بجے تک جاری رہی ۔ مولانا نے آغازِ کلام کرتے ہوئے کہا :

"ہم آپ سے ملاقات یا آپ کی حمایت اس لئے نہیں کر رہے کہ ہمارے دلوں میں کوئی خوف یا لالچ ہے ۔ آپ احتساب کی بات کرتے ہیں تو جناب ہمیں اس احتساب کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں ، آپ تو ابھی تک ان لوگوں کے خلاف بھی کچھ نہیں کر سکے جو معاملات میں براہِ راست ملوث بلکہ یوں کہئیے کہ دلدل میں دھنسے ہوئے تھے ۔ ہمارے ہاتھ تو بہرحال کہیں زیادہ صاف ہیں ۔ اس وقت کیفیت یہ ہے کہ ہمیں آپ کا ایجنٹ سمجھا جا رہا ہے ، پریس ہمیں گالی دے رہا ہے ، ہمارے دوست مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں ۔ مگر ہم صرف ملک اور قوم کے بہتر مستقبل کی خاطر آپ کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں ، ہم حکومت میں محض ملک بچانے کے لئے آنے پر آمادہ ہیں ورنہ ہمیں کرسیوں کی کوئی ہوس نہیں ۔ پیپلز پارٹی میں میرے گروپ کی طاقت کا اندازہ اس ردّ عمل سے لگایا جا سکتا ہے جو بیگم بھٹو ظاہر کر رہی ہیں ۔ آپ دیکھیں کہ وہ اور ان کے ساتھی کتنا شور مچا رہے ہیں ۔ (اس موقع پر مولانا نے بیگم بھٹو کی طرف سے اپنے نام تین اپریل ۱۹۷۸ء کو لکھا جانے والا ایک خط دکھاتے ہوئے مزید کہا کہ) اگر آپ ہمارے ساتھ بہتر معاملہ کریں گے تو اور لوگ بھی آپ کے ساتھ آملیں گے ۔ اگر قومی اتحاد والے آپ سے من حیث الجماعت تعاون نہیں کر رہے تو ہمیں موقع دیجئے ، ہم آپ کو بتائیں گے کہ ہم ان سے کہیں زیادہ طاقت ور لوگ ہیں ۔ رہا الزامات کا معاملہ تو کسی بھی حکمران کے ہاتھ مکمل طور پر کبھی صاف نہیں ہوتے ۔ تھوڑا بہت الزام تو ہر کسی پر لگایا جا سکتا ہے ۔ مسلم لیگ پر تو ملک توڑنے کا الزام بھی ہے ۔ خود آپ جب جائیں گے تو آپ کے بارے میں بھی بہت کچھ کہا جائے گا ۔ آپ لوگ ملاؤں کے ہاتھ میں مت کھیلیں ۔ لوگ سوشلزم سے اس لئے بھاگ گئے تھے کہ پیپلز پارٹی کی حکومت نے اسے ضرورت سے زیادہ مسئلہ بنا دیا ۔ اگر آپ لوگ اسلام کو مسئلہ بنائیں گے تو لوگ آپ سے بھی بھاگ جائیں گے ۔ ہماری پی پی پی میں چاروں صوبوں کی نمائندگی آپ بہ چشم خود دیکھ چکے ہیں ۔ اگر ہمیں حکومت دی گئی تو ہم وزیراعظم پر اصرار نہیں کریں گے بلکہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہی اس حکومت کے انتظامی سربراہ ہو سکتے ہیں ۔ صوبوں میں یہ کام

متعلقہ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹروں کے سپرد کیا جا سکتا ہے ۔ آپ کے موجودہ مشیروں میں سے چند ایک کو رکھا جا سکتا ہے لیکن ان میں اکثریت بے مصرف لوگوں کی ہے ۔"

یہ تمام لیڈرانِ کرام اپنی اپنی کہہ کر چلے گئے تو جنرل ضیاءالحق نے الیکشن سیل کے رفقاء کے ساتھ ایک الگ نشست کی جس میں "قومی حکومت" کے مسئلہ پر سیر حاصل بحث ہوئی اور آخر میں جنرل صاحب نے کہا، "ہم زیادہ سے زیادہ سیاستدانوں کی ایک مشاورتی کمیٹی بنا سکتے ہیں ، قومی حکومت کا تصور ہی فضول ہے ۔"

اس کے بعد ایک اہم اجلاس ۳ – جون ۱۹۷۸ء کی صبح جی ایچ کیو میں ہوا، جنرل ضیاءالحق فلو اور نمونیہ کے شدید دورہ سے نجات پا کر ، بہت دنوں بعد دفتر آئے تھے ۔ انہوں نے کہا، "میں نے "طویل غوروخوض" اور صلاح مشورہ کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ ملک میں کوئی قومی حکومت نہیں بنائی جائے گی ۔ اس کے علاوہ میں نے تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد کر کے ، سیاسی جماعتوں کے بارے میں ایک نیا ایکٹ بنانے کا فیصلہ کیا ہے جس کی رو سے ملک میں صرف تین سیاسی جماعتوں کو کام کرنے کی آزادی ہو گی ۔ مشیروں کی موجودہ کونسل توڑ کر میری قیادت میں ایک باضابطہ کابینہ بنائی جائے گی جس میں کسی وفاقی سیکرٹری کو وزیر نہیں بنایا جائے گا ۔ اسی طرح صوبوں میں بھی تمام مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر حضرات حکومتیں بنائیں گے ، قائم مقام گورنروں کو چھٹی دے دی جائے گی ، انتخابات جلدی نہیں ہوں گے ، اور جب کبھی ہوں گے، غیر جماعتی بنیادوں پر ہوں گے ۔ قانون دانوں کی ایک کمیٹی تشکیل دی جا رہی ہے جو سیاسی جماعتوں کے قانون اور آئین میں حسبِ ضرورت ترامیم کرے گی کیونکہ عدالتیں مجھے آئین میں ترمیم کرنے کا حق دے چکی ہیں ۔ جسٹس حمودالرحمٰن اس کمیٹی کے چیئرمین ہوں گے ۔ پیپلزپارٹی پر مناسب وقت پہ پابندی عائد کر دی جائے گی مگر اس سے قبل اس کے لیڈروں کو نااہل قرار دے کر سیاسی طور پر انہیں رسوا کیا جائے گا ۔ فی الحال صرف بلدیاتی انتخابات ہوں گے اور وہ اسی سال کرا لیے جائیں گے ۔"

اس روز پہلی بار انہوں نے اپنے آئندہ عزائم سے اپنے رفقاء کو کھل کر آگاہ کیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ :

"میں نے پانچ روز تک سندھ کا دورہ کیا ہے ، لوگ قومی حکومت یا انتخابات وغیرہ کچھ بھی نہیں چاہتے ، وہ صرف امن و امان کی صورتِ حال ، بڑھتی ہوئی مہنگائی اور نظامِ مصطفٰے کے نفاذ کے لئے فکر مند ہیں ۔ اس لئے ہمیں انتخابات وغیرہ کے چکر میں پڑنے کی بجائے ان معاملات پر توجہ دینی چاہئیے ۔"

یہاں ریکارڈ کی خاطر یہ بات بھی یاد رہے کہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے قومی حکومت میں شمولیت کے لئے ملاقاتوں سے قبل ان سیاسی رہنماؤں نے الیکشن سیل کے اراکین سے فرداً فرداً یا اجتماعی طور پر مل کر اپنا جواب اثبات میں دے دیا تھا ۔ اور جنرل چشتی نے ۴ – اپریل ۱۹۷۸ء کو (بھٹو کی پھانسی

سے ٹھیک ایک سال قبل) جنرل ضیاءالحق کو یہ رپورٹ دی تھی کہ پی این اے کے رہنما حکومت میں شمولیت پر آمادہ ہیں ۔ البتہ جمعیت العلماء پاکستان والوں نے یہ شرط رکھی ہے کہ وہ قومی اتحاد کی طرف سے نہیں بلکہ اپنی جماعت کی جانب سے الگ طور پر حکومت میں شامل ہونے پر آمادہ ہیں ۔ این ڈی پی نے خود آنے سے انکار کر دیا ہے مگر انہیں پی این اے کی شمولیت پر کوئی اعتراض نہیں اور وہ عدم تعاون کی راہ اختیار نہیں کریں گے ۔ اصغر خان نے بطور جماعت حکومت میں آنے سے انکار کر دیا ہے البتہ اگر سربراہانِ جماعت کی حکومت بنائی جائے تو وہ اس میں شامل ہو سکتے ہیں ۔ تاہم انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ حکومت قومی حکومت وغیرہ کے چکر میں پڑنے کی بجائے انتخابات کرا دے تو بہتر ہے ۔ مولانا کوثر نیازی اوران کے رفقاء نے بھی حکومت میں شمولیت کی ہامی بھر لی ہے ۔

.....○.....

جب جنرل صاحب نے صدارت بھی سنبھال لی

۳ – جون ۱۹۷۸ء کے اس اجلاس کے بعد ۲۲ – اگست کو وفاقی کابینہ کا ایک خصوصی اجلاس ہوا ۔ اس میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاءالحق نے اپنے رفقاء کو آگاہ کیا کہ کل (۲۳ – اگست کو) وہ نئی کابینہ تشکیل دینا چاہتے ہیں جس میں قومی اتحاد کے سات وزراء بھی شامل کئے جائیں گے ۔ انہوں نے اپنے پرانے رفقاء کو بتایا کہ آپ لوگ حسبِ سابق کام کرتے رہیں گے اور محکموں میں کوئی خاص ردّوبدل نہیں ہو گا ۔ غلام اسحٰق خان اور آغاشاہی بھی بدستور بطور وزیر کام کرتے رہیں گے ۔ انہوں نے کہا کہ نئی کابینہ کے حوالے سے ان کے سامنے تین راستے تھے ، ایک یہ کہ موجودہ کابینہ کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے فرمان کے تحت برطرف کر کے اس کی جگہ نئی کابینہ لائی جائے ۔ دوسرا یہ کہ صرف نئے شامل ہونے والوں سے حلف لے لیا جائے اور تیسرا یہ کہ آپ سب لوگ بھی مستعفی ہو کر دوبارہ ان لوگوں کے ساتھ کابینہ مینآ جائیں ۔ میں نے تیسرا راستہ اپنانے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ عوام میں یہ تأثر گہرا ہو سکے کہ میرے رفقاء مجھ پر پورا اعتماد رکھتے ہیں اور انہیں یہ بھی اندازہ ہو کہ ہم ایک نئی ، سویلین حکومت کو موقع دے رہے ہیں ۔ آپ لوگ کل شام پونے پانچ بجے حلف اٹھانے کے لئے تیار رہیں ۔

جنرل صاحب کی اس تقریرِ دل پذیر کے بعد ان کے "رفقاء" نے وہیں پر اپنے اپنے استعفے لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کر دیئے ، مگر اگلی شام جب یہ لوگ روانگی کے لئے گاڑیوں میں بیٹھ رہے تھے تو جنرل صاحب کا فون آگیا ۔ انہوں نے اپنے وردی والے تینوں رفقاء (جنرل چشتی ، جنرل میاں اور جنرل گل حسن) سے کہہ دیا کہ وہ حلف کے لئے آنے کی زحمت نہ کریں ۔ انہوں نے اپنے اس فیصلہ کی توجیہہ کرتے ہوئے ، ان میں سے ایک جرنیل کو کہا، "میں سمجھتا ہوں ، اس سے ملک اور قوم کو فائدہ ہو گا ، اور بین الاقوامی سطح پر ہمارا وقار بلند ہو گا کہ ہم نے سویلین حضرات کو فیصلے کرنے کا موقع دیا ہے ۔" اس موقع پر

انہوں نے بات کرتے کرتے انگریزی بولنا شروع کر دی اور کہا :

"I have decided to give them a chance but if these buggers do not deliver the goods, I will send the whole lot home and then we will remain as long as ...."

اس موقع پر اچانک انہیں احساس ہوا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں ، انہوں نے فوراً خود کو بریک لگائی اور جملہ یوں مکمل کیا کہ

"I mean we will remain till the elections."

آخر میں انہوں نے اپنے ان ساتھی جرنیلوں کو تسلی دیتے ہوئے کہا، "آپ فکر نہ کریں ، میری اصل طاقت بہرحال میرے کور کمانڈرز ۔۔۔ اور پرنسپل سٹاف افسران ہی رہیں گے ۔"

الیکشن سیل میں موجود تمام جرنیلوں کی متفقہ رائے تھی کہ جنرل ضیاءالحق نے ان سے پیشگی مشورہ نہ کر کے زیادتی کی ہے ، ان کا خیال تھا کہ یہ فیصلہ کرتے وقت صرف جنرل عارف اور اس وقت کے ڈی ۔ جی ۔ آئی ۔ ایس آئی جنرل ریاض محمد خان (مرحوم) سے مشورہ لیا گیا ۔ یہ وہ پہلا موقع تھا جس پر جنرل صاحب کے "رفقاء" نے خود کو اندر سے مجروح محسوس کیا۔ مگر یہ بات بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ وفاقی کابینہ سے قبل کور کمانڈروں کا اجلاس ضرور ہوتا اور جنرل صاحب تاثر یہی دیتے کہ وہ اصل فیصلے اپنے انہی رفقاء کے مشورہ سے کرتے ہیں ۔

۱۵ – ستمبر کو اس وقت کے صدر مرحوم فضل الٰہی چودھری نے ایک آرڈی ننس کی منظوری دی جس کے تحت ملک کے لئے صدر نامزد کرنے کا اختیار چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاءالحق کو دے دیا گیا تھا۔ جنرل صاحب نے مرحوم چودھری صاحب کو یہی تاثر دیا تھا کہ وہ خود انہی کو دوبارہ صدر نامزد کرنا چاہتے ہیں کیونکہ بطور صدر ان کی میعاد ۱۶ – ستمبر کو ختم ہو رہی تھی مگر اگلے روز چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاءالحق نے خود اپنے آپ کو ملک کا آئندہ صدر نامزد کر کے سب کو حیران کر دیا ۔ خود ان کے "رفقاء" اور فوج کے دیگر حلقوں میں بھی اس بات کو پسند نہ کیا گیا اور ایک جرنیل نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ، اپنے کسی قریبی دوست سے کہا:

"I think CMLA is geting too much in his plate".

ان کے بقول جنرل ضیاءالحق ایک بار خود انہیں یہ کہہ چکے تھے کہ

"I will never like to be the President".

مگر اس کے باوجود موقع ملتے ہی انہوں نے صدارت پر قبضہ کرنے میں لمحہ بھر کا تردّد بھی روا نہیں رکھا ۔

اس زمانے میں بھٹو خاندان اور ان کے بعض "رفقاء" مثلاً نصیراللہ بابر وغیرہ نے نجی محفلوں میں جیل توڑ کر بھٹو صاحب کو بیرونِ ملک "سمگل" کر دینے کی باتیں شروع کر رکھی تھیں ۔ یہ باتیں ظاہر ہے کہ جنرل صاحب تک بھی پہنچیں اور انہوں نے بھٹو کے گرد پہرہ سخت کرنے کا حکم دے دیا ۔ اس موقعہ پر انہیں ایک بار پھر اپنے پرانے "رفقاء" کی یاد آئی ۔ ۳۱ - اکتوبر کی صبح ان کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈیر ظفر نے الیکشن سیل کے جرنیلوں سے کہا کہ وہ جنرل چشتی کے دفتر میں جمع ہونے کے بعد صدرِ مملکت سے ملنے آئیں ۔ جنرل چشتی نے اپنے دفتر میں جمع ہونے والے جرنیلوں سے اشارے کنائے میں بات کرتے ہوئے کہا کہ اگر خدانخواستہ چیف کو کچھ ہو جائے تو ہمیں اس کیلئے بھی متبادل انتظام رکھنا چاہئیے ۔ دراصل چشتی صاحب ملفوف انداز میں یہ تجویز پیش کر رہے تھے کہ انہیں ڈپٹی چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا جائے ۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ صدرِ مملکت ایک بار پھر تین یا چار جرنیلوں کو حکومت میں شامل کرنا چاہتے ہیں ۔ جنرل جمال سید میاں چونکہ قبائلی پٹھان ہیں اس لئے وہ اس موقع پر اپنا غصہ نہ چھپا سکے اور صاف کہہ دیا کہ اگر صدر صاحب محض چند روز کے لئے ہمیں وزیر بنا کر کوئی اور "کٹکا بازی" کرنا چاہتے ہیں تو ہم شامل نہیں ہونا چاہتے ، مگر جنرل چشتی نے یقین دلایا کہ یہ کابینہ ، مارشل لاء کے آخر تک چلے گی ۔ اس کے بعد یہ لوگ جنرل ضیاءالحق سے ملنے گئے تو انہوں نے کہا کہ یہ میرے اندرونی حلقہ Inner Circle کا اجلاس ہے ، اسکے بعد انہوں نے کہا کہ وہ چند جرنیلوں کو بھی کابینہ میں شامل کرنا چاہتے ہیں تاکہ سویلین حضرات کے سامنے جو بات وہ خود نہ کہنا چاہیں ، اپنے ان "رفقاء" سے کہلوا سکیں ۔

اس موقع پر آئی ۔ ایس ۔ آئی کے ڈائریکٹر جنرل مرحوم جنرل ریاض محمد خان نے صدر مملکت کو مشورہ دیا کہ وہ اپنا کوئی جانشین مقرر کر دیں ۔ یہ تجویز پیش کرتے وقت انہوں نے کن انکھیوں سے جنرل چشتی کی طرف دیکھا جسے بھانپتے ہوئے ،جنرل عارف نے فوراً جواب دیا کہ اس کی ضرورت اس لئے نہیں کہ وائس چیف آف آرمی سٹاف کسی بھی ممکنہ صورتِ حال کے لئے موجود ہیں ۔ اس طرح انہوں نے بڑی صفائی سے جنرل چشتی کا معاملہ گول کر کے جنرل اقبال کو آگے لانے کا اشارہ دیا جنہیں جنرل چشتی زیادہ پسند نہیں کرتے تھے ۔ اب جنرل چشتی نے سوچا کہ کہیں اس پر واقعی عمل نہ ہو جائے اور صدر اس قسم کا کوئی فیصلہ کر ہی نہ دیں جس کے بعد جنرل اقبال نمبر دو بن بیٹھیں ۔ اس وقت تک صورتِ معاملہ یہ تھی کہ جنرل ضیاءالحق کی عدم موجودگی میں ایڈمرل شریف چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہوا کرتے تھے ۔ صدر اس صورتِ حال پر مسکراتے رہے اور کہا کہ وہ دو چار روز میں نہ صرف اس معاملہ پر غور کر لیں گے بلکہ کابینہ میں اپنے جرنیل ساتھیوں کی شمولیت کا اعلان بھی کر دیں گے ۔ اب یہ الگ بات ہے کہ چار روز بعد وہ خاموشی سے حج پر چلے گئے اور کچھ یوں کہ خاص طور سے جنرل چشتی کو اپنے اس دورہ کی ہوا تک نہ لگنے دی ۔ چشتی صاحب اس پر بہت بھنائے اور انہوں نے اپنے ایک ساتھی جرنیل جمال سید میاں سے کہا "چیف کو واپس آنے دو میں صاف کہہ دوں گا کہ اگر ہم پر اعتماد نہیں رہا تو ہمیں گھر بھیج دو ۔" جنرل جمال سید میاں جو چشتی صاحب کی خواہشوں سے بخوبی آگاہ تھے ۔ خاموشی سے ان کی باتیں سنتے اور انہیں صبر و تحمل سے کام لینے کا

مشورہ دیتے رہے ۔ مگر جنرل چشتی کے دل میں گرہ پڑ گئی ۔ چند دنوں بعد انہوں نے صدر سے کہا، "میں ۔ گلگت کے دورہ پر گیا تو وہاں پر وار کورس کے کچھ طلباء سے ملاقاتیں ہوئیں ۔ ان سے ڈپٹی چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی تعیناتی کے بارے میں بھی مشورہ مانگا۔ اکثریت کا خیال یہی تھا کہ اس قسم کے کسی فیصلہ سے فوج کا وقار مجروح ہو گا۔ گویا چشتی صاحب نے اپنی بات نہ بنتی دیکھ کر، دوسرے کا معاملہ بھی ختم کر دیا ۔

.....○.....

کوئی نہ آیا بروئے کار

ان تمام معاملات کا نتیجہ یہ نکلا کہ صدر ضیاءالحق نے جنرل چشتی کو آہستہ آہستہ غیر محسوس انداز میں علیٰحدہ کرنا شروع کر دیا۔ اور آہستہ آہستہ فوج میں اپنے قرابت داروں کا ایک حلقہ بنا کر اسے آگے لانے کی کوششیں شروع کر دیں ۔ اس سلسلہ کا آغاز ۲۳ – مارچ ۱۹۷۹ء سے ہوا جب تقریباً تمام کور کمانڈروں کے ساتھ ساتھ جنرل رحیم الدین کو بھی تمغۂ بسالت دے دیا گیا ۔ مگر چشتی صاحب وہ واحد جرنیل تھے جنہیں اس کا اہل نہ سمجھا گیا ۔ مارچ ۱۹۸۰ء میں فوج سے اپنی ریٹائرمنٹ تک جنرل چشتی کے ذہن میں یہی تھا کہ "چیف" صاحب انہیں کسی بہتر عہدے پر فائز کر دیں گے ، مگر اپنی ریٹائرمنٹ کے موقع پر خود منہ سے مانگنے کے باوجود انہیں پنجاب کی گورنری تک نہ مل سکی ۔

صدر ضیاءالحق نے اپنے ساتھی تبدیل کر لئے تھے ۔ اب اعلیٰ سطحی اجلاسوں میں ان کے مطلب کی بات جنرل چشتی کی بجائے ، جنرل اختر عبدالرحمٰن ، جنرل مجیب الرحمٰن اور جنرل رحیم الدین خان کیا کرتے ۔ کابینہ سے قبل ہمیشہ معمول کے مطابق ان فوجی رفقاء کے ذریعہ ملٹری کونسل میں اپنی مرضی کے فیصلے کرائے جاتے جن کے بعد کابینہ کو حسب ضرورت خبر دے دی جاتی ۔ بھٹو کی پھانسی کا فیصلہ تو ظاہر ہے کہ لاہور ہائی کورٹ اور پھر سپریم کورٹ ہی نے کیا ، مگر اس پر عملدرآمد کرنے اور بھٹو کو معاف نہ کرنے کا فیصلہ ۱۲ – فروری ۱۹۷۹ء کو ملٹری کونسل کے اجلاس میں کیا گیا ۔ جنرل اقبال اور بعض دوسرے جرنیلوں نے مخالفانہ رائے ظاہر کی مگر تب تک صدر ضیاء اپنے پتے لگا چکے تھے ۔ نتیجہ یہ کہ انہوں نے اپنے قریبی رفقاء کے ذریعہ اپنی مرضی کا فیصلہ منظور کروا لیا ۔ اور ۴ – اپریل کی صبح چار بجے انہیں پھانسی دے کر فراغت حاصل کر لی ۔ اور کچھ اس شان سے کہ سرکاری اعلامیہ پھانسی کے بعد انہیں نوڈیرو کے قریب دفن کیے جانے کے بعد صبح دس بجے جاری کیا گیا ۔

اس حوالے سے بھٹو صاحب کے حامی جس "بین الاقوامی دباؤ" کی باتیں کرتے رہے اس کی جنرل

صاحب کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں تھی ۔ ۶ ۔ فروری ۱۹۷۹ء کی صبح گیارہ بج کر دس منٹ پر سپریم کورٹ نے بھٹو کی اپیل مسترد کر دی ۔ ۷ ۔ فروری کی شام جنرل ضیاءالحق کے گھر میں جرنیلوں کا ایک غیر رسمی اجتماع جنرل شریف کی ریٹائرمنٹ پر الوداعی پارٹی کے سلسلہ میں ہوا ۔ اس میں تقریباً تمام اہم جرنیل موجود تھے ۔ باتوں باتوں میں جنرل ضیاءالحق نے بتایا کہ چند ممالک نے بھٹو کے لئے رحم کی اپیل کی ہے مگر کسی طرف سے کوئی خاص دباؤ نہیں ۔ جنرل مجیب الرحمٰن نے کہا کہ ملک کے اندر بھی کوئی خاص ردّعمل نہیں اور معاملات ٹھیک ٹھاک چل رہے ہیں ۔

تاہم پھانسی سے قبل جنرل صاحب نے عوامی توجہ ہٹانے کے لئے بعض اقدامات ضرور کیے ۔ ان میں ۱۰ ۔ فروری کو عید میلادالنبی کے موقع پر کیا جانے والا شراب اور جوئے پر پابندی لگانے کے فیصلوں کا اعلان بھی شامل تھا ، مگر اہم ترین اعلان وہی تھا جو انہوں نے ۲۳ ۔ مارچ کو یومِ دفاع پاکستان کے موقع پر کیا ۔ اس اعلان میں جنرل صاحب نے آئندہ انتخابات ۱۷ ۔ نومبر ۱۹۷۹ء کو کرانے کی تاریخ دینے کے ساتھ ساتھ سیاسی جماعتوں اور انتخابی امیدواروں کو یہ مشورہ بھی دیا کہ اب کی بار وہ انتخابات کے لئے "ہوم ورک" مکمل کریں اور غیر متعلق باتوں میں الجھنے سے گریز کریں ۔

پیپلزپارٹی کی قیادت نے اس موقع پر بھی بے دانشی کا رویہ اپنایا ۔ بجائے اس کے کہ وہ عوام کو حقیقی خطرہ سے آگاہ کرتے ، ان کی جانب سے یہی تأثر دیا جاتا رہا کہ جنرل ضیاءالحق بھٹو کو پھانسی دے ہی نہیں سکتے ۔ بیرونِ ملک سے آنے والے معمولی پیغامات کو پارٹی کا ترجمان اخبار بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ۔ نتیجتاً عوام کے دلوں میں یہ بات راسخ ہوتی چلی گئی کہ بھٹو کوئی سپرمین ہیں جنہیں پھانسی دینا ضیاءالحق کے بس کا روگ ہی نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ بھٹو کی پھانسی کے بعد بھی اکثر و بیشتر غیر یقینی کی کیفیت ہی ہم گیر رہی اور عوام سڑکوں پر نہ نکل سکے ۔

بھٹو سے نجات پانے کے بعد جنرل صاحب نے دروغ مصلحت آمیز پر مبنی اپنے تازہ وعدے سے گلو خلاصی کرنے کے لئے کام شروع کر دیا ۔ ۲۹ ۔ اگست کو انہوں نے اپنے رفقاء کا ایک اہم اجلاس طلب کر کے انتخابی انتظامات کا معاملہ ان کے سامنے رکھا ۔ اجلاس کے آغاز ہی میں جنرل صاحب کے "اصل رفقاء" نے حالات کی منظر کشی اس انداز میں شروع کی جس سے مجموعی تأثر یہی بنتا تھا کہ اگر انتخابات منعقد کرائے گئے تو ملک ٹوٹ جائے گا ۔ لیکن اس اجلاس میں خلافِ توقع ، مخالفانہ آراء زیادہ گونج دار طریقہ سے پیش کی گئیں ۔ جرنیلوں کی اکثریت نے یہی کہا کہ جناب آپ یہ روز روز کا کھڑاک بند کریں اور ایک ہی دفعہ فیصلہ کریں کہ آپ نے کیا کرنا ہے اور پھر اس پر ڈٹ جائیں ۔ یہ جو آپ روز روز بیان تبدیل کر رہے ہیں ، اس سے عوام میں ہمارا وقار مجروح ہو رہا ہے ۔ صدر صاحب نے جو یہ صورتِ حال دیکھی تو فوراً نیا پانسا پھینکتے ہوئے جنرل رحیم الدین خان اور جنرل عباسی پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دے دی جس کے ذمہ صورتِ حالات کا جائزہ لے کر دس ستمبر تک رپورٹ کرنے کا فریضہ لگاتے ہوئے انہوں نے اپنے فوجی رفقاء

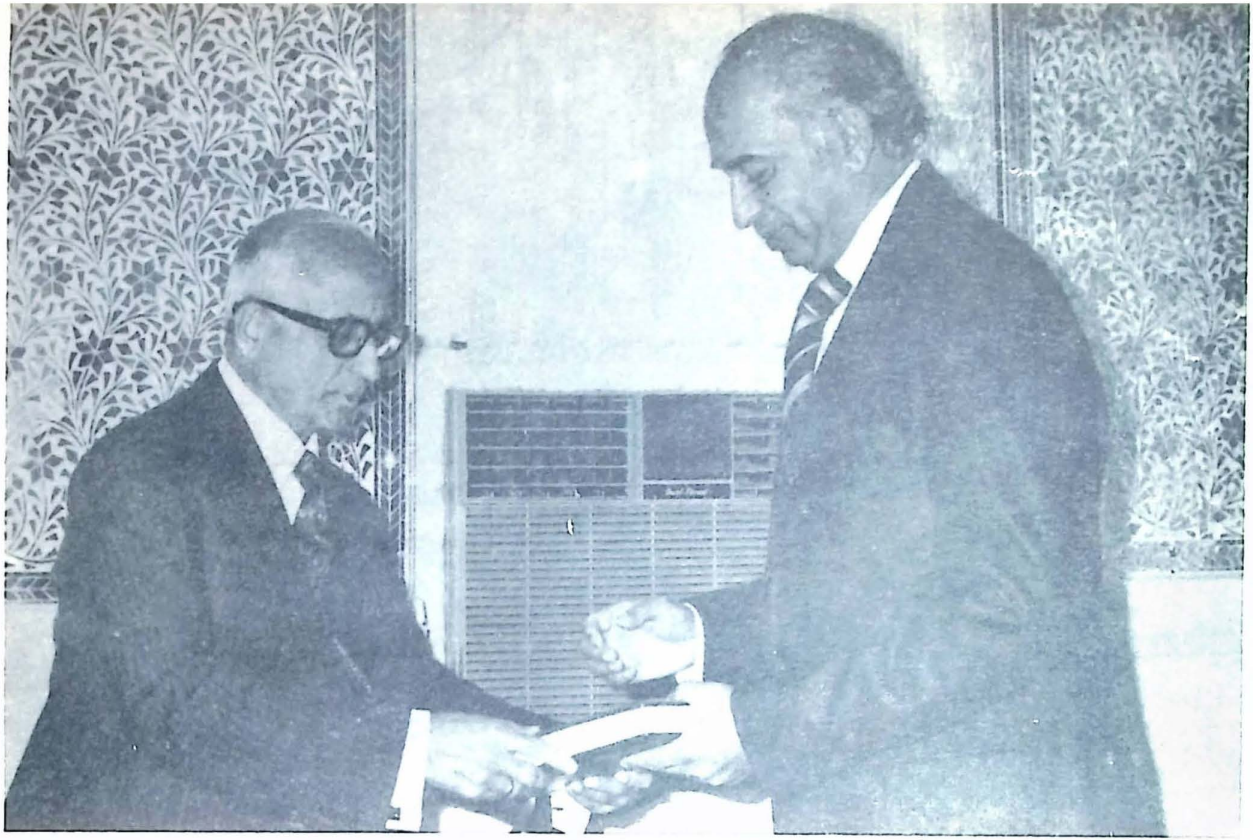

جسٹس انوارالحق وزیراعظم بھٹو کو ایک رپورٹ پیش کر رہے ہیں۔

سے کہا، "ٹھیک ہے ، یہ رپورٹ آ جائے تو ۱۲ – ستمبر کو ہم مل بیٹھ کر فیصلہ کر لیں گے" ۔

۱۲ – ستمبر کو اس "ذیلی کمیٹی" کی رپورٹ آ گئی ، جس میں یہ سفارش کی گئی تھی کہ صدرِ مملکت دو سے لیکر پانچ سال تک ملک کا اقتدار سنبھالے رکھیں اور اس دوران نہ صرف یہ کہ ملک کے اقتصادی حالات ٹھیک کئے جائیں بلکہ سیاسی طور پر بھی اہم فیصلے کئے جائیں ۔ اس رپورٹ میں مارشل لاء کو ملک کا "اعلیٰ ترین قانون" قرار دینے اور آئین توڑ دینے یا اس میں مناسب ترامیم کر کے اسے حالات کے مطابق بنانے تک کے مشورے شامل تھے ۔ اس کے علاوہ سیاسی جماعتوں پر مکمل پابندی عائد کرنے اور ان کی سرگرمیاں روک دینے کا مشورہ دیتے ہوئے یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ مارشل لاء کو سختی سے نافذ کیا جائے اور اگر کسی طرف سے ایجی ٹیشن یا ہنگامہ آرائی کی کوشش ہو تو اسے سختی سے کچل دیا جائے ۔

جنرل فضل حق ان تجاویز کے حق میں سب سے پہلے بولے اور یہ مشورہ دیا کہ جناب ، اگر یہی کرنا ہے تو پھر دیر نہ کریں اور اعلان کر دیں کہ آپ کا آئندہ پروگرام یہ ہے ۔ مگر جنرل ضیاءالحق نے ایک بار پھر اپنے روایتی انداز میں یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ ہمیں بلدیاتی انتخابات کو متاثر نہیں ہونے دینا چاہئیے ۔ اس کے علاوہ ۳۱ – اکتوبر تک سیاسی جماعتوں کو موقع دینا چاہئیے کہ وہ حسابات پیش کر کے خود کو رجسٹرڈ کرا لیں ۔ اگر وہ اس سے گریز کریں تو ہم اپنے ان یک طرفہ فیصلوں کا اعلان کر سکتے ہیں ۔ اس کے بعد اس کونسل کا اجلاس ۳۰ – ستمبر کو ہوا جس میں صدر کے ان فیصلوں کی رسمی توثیق کر دی گئی ۔ مگر یکم اکتوبر کو کابینہ کا اجلاس ہوا تو صدر نے اپنے سویلین رفقاء کو اصل فیصلوں کی ہوا تک نہ لگنے دی ۔ اس اجلاس میں معذوروں کی بحالی کے فنڈ کی منظوری دی گئی ۔

۵ – اکتوبر کو جی ایچ کیو میں مارشل لاء ایڈمنسٹریٹروں اور کور کمانڈروں کا اجلاس ہوا جس میں صدر نے کہا کہ وہ ابھی انتخابات ملتوی کرنے کے معاملہ پر مزید غور کرنا چاہتے ہیں ۔

۸ – اکتوبر کو انہوں نے اخبار نویسوں سے غیر رسمی بات چیت کرتے ہوئے بر سبیلِ تذکرہ یہ شوشہ بھی چھوڑ دیا کہ ۱۷ – نومبر کو پولنگ ممکن دکھائی نہیں دیتی ۔ اس پر کوئی خاص ردّعمل نہیں ہوا ۔ آج یہ بات کتنی المناک کیوں نہ محسوس ہو مگر حقیقت یہی ہے کہ سیاسی زعماء نے جنرل ضیاءالحق کی طرف سے اس نوعیت کے اقدامات کی کبھی کھل کر مخالفت نہ کی اور سیاسی نورا کشتی کے انداز میں بیان بازی سے معاملہ کبھی آگے نہ بڑھ سکا ۔

۱۷ – اکتوبر کو صدر جنرل محمد ضیاءالحق نے ملک میں مارشل لاء سخت کرنے ، سیاسی جماعتوں پر پابندی ، ان کے دفتروں پر تالے لگانے ، اخبارات پر سنسر عائد کرنے اور انتخابات غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی کر دینے کا اعلان کر دیا ۔ یہ اتنا بڑا اقدام تھا جس پر سیاستدانوں کو بلبلا اٹھنا چاہئیے تھا ، مگر اس زمانے

جسٹس انوارالحق چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاءالحق سے عہدۂ صدارت کا حلف لے رہے ہیں ۔ ۱۶ ۔ ستمبر ۱۹۷۸ء)

کے اخبارات اٹھا کر دیکھئے تو حیرت ہوتی ہے کہ

کہیں کہیں پہ ستاروں کے ٹوٹنے کے سوا
افق اداس ہے ، دنیا بڑی اندھیری ہے

شاعر جمہوریت حبیب جالب نے انہی دنوں ایک شعر کہا تھا

کوئی تو پرچم لے کر نکلے اپنے گریباں کا جالب
چاروں جانب سناٹا ہے ، دیوانے یاد آتے ہیں

مگر کوئی دیوانہ ، دشتِ جنوں کی بادیہ پیمائی کے لئے باہر نہیں نکلا ۔۔۔۔ ایک آدھ بیان جو جاری بھی ہوا ، سنسر کی نذر ہو گیا ۔

.....○.....

بھٹو کی پھانسی ۔ اصل روداد

سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے حوالے سے مختلف وقتوں میں مختلف باتیں شائع ہوتی رہیں ۔ ایک مرحوم، جو اس زمانہ میں انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات تھے، ان سے جب بھی اس سلسلہ میں بات ہوئی انہوں نے شائع شدہ تفصیلات کو RUBBISH کہہ کر بات ختم کر دی، اس پر کرید ہوئی کہ اصل واقعات کی چھان بین کی جائے ۔ عینی شاہدوں سے علیحدہ علیحدہ طویل انٹرویوز کرنے کے بعد جو منظرنامہ بنتا ہے وہ اب تک شائع شدہ اخباری رپورٹوں سے خاصا مختلف ہے ۔ یوں بھی صدر ضیاءالحق کی زندگی اور عہدِ حکومت میں کس کی مجال تھی کہ اس حوالے سے اصل حقائق بیان کرتا ۔

بھٹو مرحوم کی اپیل اور اس پر نظرثانی کی درخواست مسترد ہونے کے فوراً بعد صدر ضیاءالحق نے پنجاب کے ہوم سیکرٹری سے رابطہ قائم کر کے ہدایت کی کہ بھٹو کو فوراً پھانسی پر لٹکانے کے انتظامات کئے جائیں ۔ تب ایس کے محمود پنجاب کے ہوم سیکرٹری تھے، انہوں نے جواباً بتایا کہ اتنی جلدی پھانسی دینے میں کچھ قانونی دشواریاں حاصل ہیں، پہلی تو یہ کہ رحم کی اپیل کے لئے ایک ماہ کی مدت دینا ہو گی ۔ دوسری یہ کہ رحم کی اپیل مسترد ہونے کے بعد بھی وصیت لکھنے کے لئے پندرہ دن کی مہلت بہرحال قانونی تقاضوں کا حصہ ہے ۔ اس پر صدرِ مملکت شدید غصہ میں آئے اور انہوں نے ہوم سیکرٹری کو حکم دیا کہ وہ جسٹس مولوی مشتاق حسین سے مل کر ان دشواریوں پر قابو پانے کی کوشش کریں تاکہ جلد از جلد معاملہ ختم کیا جا سکے ۔

مگر مولوی مشتاق حسین بھی ان قانونی ضرورتوں کو ختم نہ کر سکے اور رحم کی اپیل کے لئے ایک ماہ کا عرصہ دینا ہی پڑا ۔ یہ الگ بات کہ بھٹو نے رحم کی اپیل کرنے سے انکار کر دیا ۔ اور حکومت کو ان کے لیے کی جانے والی عوامی اپیلوں ہی کو مسترد کر کے فائلوں کا پیٹ بھرنا پڑا ۔ اس کے بعد وصیت لکھنے کے لیے پندرہ دن کی مہلت کا معاملہ آیا مگر بھٹو نے کوئی وصیت بھی نہیں لکھی، چند صفحات لکھے اور یہ

کہتے ہوئے پھاڑ دیئے کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ۔ اس زمانہ میں راولپنڈی جیل میں ایک بُرج تعمیر کیا گیا تھا جس پر ہر وقت ایک سٹین گن بردار چوکس محافظ موجود رہتا ۔ اس کے علاوہ بھٹو کی کال کوٹھڑی کو بھی مکمل طور پر BUG کیا گیا تھا ۔ ان کے لمحہ لمحہ بھر کی رپورٹ تیار کر کے براہِ راست ایوانِ صدر بھجوا دی جاتی جہاں اس مقصد کے لیے ایک باقاعدہ او ایس ڈی رکھا گیا تھا کہ وہ بھٹو کی حرکات و سکنات میں کوئی غیر معمولی بات محسوس کرتے ہی صدرِ مملکت کو آگاہ کرے ۔

پندرہ دن کی مہلت ختم ہونے کے بعد طے ہوا کہ بھٹو کو ۳ - اپریل کی صُبح پھانسی دے دی جائے گی ۔ مگر ۲ - اپریل کو اس قدر شدید بارشیں ہوئیں اور موسم اتنا غیر یقینی ہو گیا کہ اس سزا پر عملدرآمد ایک روز کے لیے مؤخر کرنا پڑا ۔ تین اپریل کو ان کی بیگم اور بیٹی سہالہ کیمپ سے ملاقات کے لیے لائی گئیں تو انہیں بتا دیا گیا کہ یہ آخری ملاقات ہے ، اس لیے آپ لوگ معمول کے ایک گھنٹہ سے زیادہ وقت اکٹھے رہ سکتے ہیں ۔

اس روز بھٹو خاندان کے ان تین افراد نے دو گھنٹے سے زیادہ وقت اکٹھے گزارا ۔

بھٹو کی عادت تھی کہ رات دیر گئے سوتے، انہیں کبھی بھی رات دو بجے سے پہلے نیند نہیں آتی تھی ۔ مگر آخری دنوں میں وہ جلد سو جایا کرتے اور اس مقصد کے لیے انہوں نے خواب آور گولیوں ویلیم کا استعمال کرنا شروع کر دیا تھا، رات ایک بجے کے قریب وہ دو گولیاں کھاتے اور سو جاتے ۔

تین اور چار اپریل کی درمیانی شب بھی یہی ہوا، پونے ایک بجے شب انہوں نے ویلیم کی دو گولیاں کھائیں اور سونے کے لیے لیٹ گئے ۔

اور پھر جب ساڑھے تین بجے کے قریب انہیں بیدار کیا گیا تو وہ خواب آور دوا کے زیرِ اثر نیم غنودگی کے عالم میں بُڑبُڑا رہے تھے ۔ موقع پر موجود انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات نے اس کیفیت کی اطلاع ہوم سیکرٹری کو دی ۔ اور یہ بتایا کہ بھٹو کے لیے پھانسی کا لباس تیار ہے، مگر ہوم سیکرٹری نے کہا کہ انہیں یہ لباس پہنانے کی ضرورت نہیں، آپ لوگ انہیں سٹریچر پر ڈال کر باہر لے آئیں، کھلی ہوا سے غنودگی خود بخود کم ہو جائے گی ۔

یہی ہوا ۔ باہر آتے ہی تازہ ہوا کے جھونکوں نے نیم خوابیدہ بھٹو کو مکمل طور پر بیدار کر دیا ۔ اس موقع پر انہوں نے سٹریچر سے اترتے ہوئے حفاظتی عملہ سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟

انہیں بتایا گیا کہ آپ کو چند لمحوں میں پھانسی دے دی جائے گی ۔ اس موقع پر بھٹو جلال میں آ گئے اور ایک بار پھر وہی باتیں شروع کر دیں جو وہ ان دنوں اکثر کیا کرتے تھے ۔

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے ابتدائی رفقاء

جنرل جمال سید میاں

جنرل اے کے چشتی

جنرل غلام جیلانی خان

جنرل راؤ فرمان علی

" تم لوگوں کو علم بھی ہے کہ تم کس شخص کو پھانسی چڑھا رہے ہو؟ میں اسلامی کانفرنس تنظیم کا سربراہ ہوں، مجھے اسلام اور پاکستان کے لیے کام کرنے کی سزا دی جا رہی ہے، مجھ سے پہلے شاہ فیصل کو قتل کروا دیا گیا، اب مجھے بھی اسی انجام سے ہمکنار کیا جا رہا ہے ۔ اور یہ سب کون لوگ کر رہے ہیں، بے شرم لوگ، جو غیروں کے اشارے پر، اپنے سب سے بڑے آدمی کو مار دینے پر تُلے ہوئے ہیں ۔"

اتنے میں پھانسی گھاٹ سامنے آگیا، بھٹو اپنے قدموں پر چلتے ہوئے چبوترے پر چڑھے، جلّاد نے آگے بڑھ کر اُن کے مُنہ پر سیاہ غلاف چڑھا دیا، ہاتھ اور پاؤں باندھ دیئے گئے ۔ بھٹو نے جھنجھلا کر کہا

"NOW GET ON WITH IT"

اور چند ہی لمحوں بعد ان کا جسدِ خاکی پھانسی کے رسے پر جھول رہا تھا ۔ موت کا یقین ہو جانے کے بعد ان کی نعش نیچے اتاری گئی اور گردن سے کپڑا ہٹا کر تصویریں تیار کی گئیں ۔ جسٹس مولوی مشتاق حسین کے ارسال کردہ بلیک وارنٹ پر عمل درآمد ہو چکا تھا ۔

ایک سی ون تھرٹی طیارہ چکلالہ ائیر بیس پر تیار کھڑا تھا ۔ فوج کے محکمۂ تعلقات عامہ کے بریگیڈیر تفضّل حسین صدیقی کے ذمہ یہ فریضہ لگایا گیا کہ وہ سفید کپڑوں میں ساتھ جائیں اور اِدھر اُدھر گھوم پھر کر، ایک غیر فوجی کے طور پر، ردّعمل کا مشاہدہ کریں ۔

۴ - اپریل کی صُبح دس بجے جب سورج سوا نیزے پر آیا تو بھٹو کو زیرِخاک دفنا دیا گیا ۔

گڑھی خدا بخش میں اُن کی قبر کے اندر پھانسی پا جانے والے ذوالفقار علی بھٹو کا جسدِ خاکی موجود ہے ۔ بعد میں اس خیال سے کہ کہیں آنے والے زمانوں میں راولپنڈی جیل کو قومی یادگار نہ بنا دیا جائے ، صدر ضیاءالحق نے اس جیل کو جلد از جلد مسمار کرنے کا حکم دے دیا ۔ اڈیالہ جیل بننے کے باوجود راولپنڈی میں ایک سب جیل کی ضرورت تھی، مگر اُنہوں نے اس جیل کو باقی رکھنے کی اجازت نہیں دی ۔

.....○.....

شوریٰ اور اس کے بعد

انتخابات غیر معینہ مدت تک ملتوی کرنے کا یہ فیصلہ گویا جنرل ضیاءالحق کے اس اعتماد کا شاخسانہ تھا کہ وہ جو بھی فیصلہ کر لیں ، جو بھی اعلان کر دیں ، کسی کو اس پر چوں کرنے کی مجال نہیں ہو گی ۔ اس دوران میں انہوں نے اِدھر اُدھر موجود اپنے صلاح کاروں سے جو مشورے کیے ان کا نتیجہ جلد ہی ایک ہدایت کی صورت میں سامنے آیا جو صوبائی حکومتوں کے ذریعہ ڈپٹی کمشنروں اور پولیس کے ضلعی حکام کو جاری کی گئی تھی ۔ اس ہدایت کی روشنی میں ان افسرانِ کرام نے اپنے اپنے علاقوں میں موجود ایسے افراد کی فہرستیں تیار کرنا شروع کر دیں جو ممکنہ انتخابات کی صورت میں منتخب ہو کر قومی اداروں میں شریک و شامل ہو سکتے تھے ۔ قومی اور صوبائی سطح کے ان منتخبِ روزگار "نمائندگانِ کرام" کی فہرستیں جلد ہی جنرل صاحب کو موصول ہو گئیں اور انہوں نے اپنے سراغ رساں اداروں کو ان امیدواروں کے کوائف کی تصدیق یا تردید کرنے کے بارے میں ہدایات جاری کر دیں ۔ ان امیدواروں کے بارے میں انتخابی کامیابی کے ساتھ ساتھ "صالحیت" کی جو شرط رکھی گئی تھی ، اس کی بناء پر ضلعی انتظامیہ کو خوب کھل کھیلنے کا موقع ملا اور یوں قومی رہنماؤں کی ایک ایسی کھیپ تیار ہو کر سامنے آ گئی جسے "قومی رہنماؤں" کے طور پر منتخب پارلیمنٹ کا نعم البدل بننا تھا ۔

یوں وہ مجلسِ شوریٰ سامنے آئی جس میں شامل افراد اگلے دو اڑھائی برسوں تک قوم کے مستقبل سے کھیلتے رہے اور یہ عجیب لطیفہ کی بات ہے کہ اس "شوریٰ" میں بھی ایک اپوزیشن موجود تھی ، جو حکومتی سرگرمیوں پر مثبت انداز میں تنقید کر کے ، کاروبارِ حکومت کو "جمہوری انداز" میں چلانے کا فریضہ انجام دے رہی تھی ۔ یہ ایک ایسا تماشا تھا جس پر مارشل لاء کے سیاسی حلیف بھی بلبلا اٹھے ۔ حریف تو خیر اسے لائقِ دشنام سمجھتے ہی تھے ، مگر خود حلیفوں نے بھی اس کا سواگت انتہائی ناگواری سے کیا اور اندر ہی اندر لاوا پکنا شروع ہو گیا ۔ ادھر صدر جنرل ضیاءالحق ان سب باتوں سے بےنیاز ملک کو تعمیر و ترقی کے

نام پر اپنے انداز میں اپنی ڈگر پر آگے بڑھاتے رہے ۔

اس حوالے سے ان کا اعتماد یہاں تک بڑھ گیا کہ خود اپنے فوجی رفقاء کو بھی اس "پارلیمنٹ" کی دھونس دینے لگے اور جب بھی اپنی مرضی کا کوئی فیصلہ کرانا ہوتا ، وہ ہمیشہ یہی مؤقف اختیار کرتے کہ اس سلسلہ میں "شوریٰ" کی طرف سے دباؤ بڑھ گیا ہے ۔ اسلام آباد میں سٹیٹ بنک کی جو عمارت پہلے پارلیمنٹ ہاؤس کہلاتی تھی ، اب مجلسِ شوریٰ کے حوالے سے پہچانی جانے لگی ۔

سیاسی محاذ پر ان اقدامات کے بعد انہوں نے فوج پر توجہ دی اور آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقہ پر اپنے اعتماد کے آدمیوں کو آگے لانا شروع کر دیا ۔ میجر جنرل اختر عبدالرحمٰن نے بارہویں ڈویژن کے کمانڈر کی حیثیت میں ایف ۔ ایس ۔ ایف کے سابق ڈائریکٹر جنرل مسعود محمود سے پوچھ گچھ کی اور اس پوچھ گچھ کے نتیجہ میں مسعود محمود بھٹو کے خلاف وعدہ معاف گواہ بن گئے تھے ۔ ان جنرل صاحب کو ملک کے حساس ترین ادارے انٹر سروسز انٹیلی جنس کا سربراہ مقرر کر دیا گیا ۔ صدر ضیاءالحق کی طرح جنرل اختر عبدالرحمٰن کے بعض عزیزوں پر بھی قادیانی ہونے کا شبہ کیا جاتا تھا اور تحریکِ ختمِ نبوت کے ایک رہنما مولانا تاج محمود مرحوم لائلپوری نے صدرِ مملکت سے ملاقات کر کے اپنے اس شبہ کا اظہار ان سے بھی کیا ، مگر صدرِ مملکت نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ اب وہ تائب ہو چکے ہیں ۔ اسی دوران میں افغان سرحدات پر بھی خطرات کے بادل لہرانے لگے ۔ جنرل صاحب نے اس معاملہ کو نہ صرف بین الاقوامی بلکہ قومی سطح پر بھی اپنے حق میں خوب خوب استعمال کیا۔دائیں بازو کی اکثر جماعتوں نے اس نازک صورت حال میں ان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا ۔ ان میں جماعتِ اسلامی پیش پیش تھی اور واقعہ یہ ہے کہ جنرل صاحب نے اپنی دوسری حلیف جماعت مسلم لیگ کی قیادت سے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اندرونِ ملک سیاست پر توجہ دیں ۔ جہاں تک افغانستان اور مجاہدین کا معاملہ تھا ، یہ خالصتاً جماعت اسلامی کے سپرد کر دیا گیا ۔ افغانستان اور جہادِ افغانستان کے حوالے سے پاکستان کو کیا حاصل ہوا ، اور کون سے نقصانات اس کے حصہ میں آئے ، اس پر کھل کر بات کرنا موجودہ بین الاقوامی صورت حالات میں من حیث القوم ہمارے لئے ایک تکلیف دہ معاملہ بن جائے گا اور شاید یہی وجہ ہے کہ ملک کے بیشتر سیاسی رہنماؤں نے بھی اس موضوع پر کھل کر بات کرنے سے ہمیشہ گریز ہی کی راہ اپنائی ہے ۔ مگر مستقبل کا مؤرخ اس دلچسپ سوال پر حیران ضرور ہو گا کہ افغان عوام کے حقِ خودارادیت کی بات ایک ایسے فوجی سربراہِ مملکت کی طرف سے کی جارہی تھی جو خود اپنے ملک میں مارشل لاء کو طول دے کر اپنے عوام کو حقِ خودارادیت سے محروم رکھنے کی پالیسی پر کاربند رہے ۔ افغان مسئلہ پر بالواسطہ مذاکرات کا آغاز ہوتے ہی مجلسِ شوریٰ کا وجود بھی ہَوا میں تحلیل ہو گیا اور صدرِ مملکت نے ایک بار پھر نئی منصوبہ بندی شروع کر دی تاکہ معاملات کو نئے انداز میں چلانے کے ایک اور دور کا آغاز کیا جا سکے ۔

اس دور کا آغاز کرنے کے لئے جنرل صاحب کے ایک معتمد اور دیرینہ رفیق اور اس وقت کے وفاقی وزیر مسٹر محمود اے ہارون کی اقامت گاہ پر ۱۸ – جنوری ۱۹۸۳ء کو ایک اہم اجلاس منعقد ہوا جس میں

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے ابتدائی رفقاء

جنرل اقبال خان

جنرل سوار خان

جنرل رحیم الدین

جنرل کے ایم عارف

شرکت کے لئے محمود ۔ اے ۔ ہارون کے برادرِ بزرگ یوسف ہارون اور دبئی کے ایک نامور تاجر مسٹر گلہ داری خاص طور سے تشریف لائے ۔ انہی دنوں جنرل صاحب نے سیاسی رہنماؤں کے ساتھ ازسرِنو بات چیت کی ضرورت پر زور دیا تھا ۔ یوسف ہارون کا خیال یہ تھا کہ وہ اس حوالے سے قومی سطح پر کوئی خدمت انجام دے سکتے ہیں اور سیاستدانوں کی گول میز کانفرنس طلب کی جا سکتی ہے ۔ وہ یہ تجویز لے کر صدرِ مملکت کے پاس گئے بھی ، مگر جب واپس آئے تو ان کے پاس صرف اتنی خبر تھی کہ صدر نے ملک میں بعض اہم انتظامی تبدیلیوں کا فیصلہ کیا ہے ۔ محمود اے ہارون نے اس وقت کی وفاقی کابینہ میں موجود اپنے ایک رفیق سے بات کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ صدر نے جنرل لودھی کو بلوچستان اور جنرل جمال سید میاں کو سندھ کا گورنر بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے جبکہ پنجاب اور سندھ کے بارے میں خود ان سے کہا ہے کہ وہ ان دونوں صوبوں کی قیادت کے لئے نام بتائیں ۔ اس موقع پر موجود جنرل جمال سید میاں نے کہا کہ اگر وہ واقعی آپ کے مشورہ پر عمل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں کہئے کہ جنرل اختر عبدالرحمٰن کو پنجاب اور جنرل جہانداد کو سرحد کا گورنر بنا دیں ۔ مگر سوال یہ ہے کہ وہ جنرل فضل حق کو کیوں تبدیل کرنا چاہتے ہیں ۔ اس پر محمود اے ہارون نے جواب دیا کہ صدرِ مملکت جنرل فضل حق کو ضرورت سے زیادہ Ambitious قرار دیتے ہیں ۔ جہاں تک جنرل جہانداد کا سوال ہے ان کے بارے میں بات ہوئی تھی ۔ صدر کے خیال میں وہ اچھے آدمی ہیں مگر انہیں گورنر نہیں بنایا جا سکتا ۔ ۲۹ – فروری کو صدر کے نئے چیف آف سٹاف جنرل وحید نے اپنے بعض قریبی رفقاء کو بتایا کہ صدر مملکت جلد ہی وفاقی کابینہ میں بھی تبدیلیاں کرنے والے ہیں ۔ انہوں نے بتایا کہ فوج میں بھی بعض اہم تبدیلیاں کی جانے والی ہیں ۔

.....○.....

اپنے ساتھیوں پر بے اعتمادی

جنرل ضیاءالحق نے اپنے پیش رو جرنیلوں اور حکمرانوں سے دو باتیں سیکھی تھیں ۔ ایک تو یہ کہ معاملات کو زیادہ دیر تک یکساں انداز میں نہیں چلنے دینا چاہئیے کیونکہ لوگ یکسانیت سے بیزار ہو جاتے ہیں ۔ دوسرے یہ کہ کسی بھی شخص پر اعتماد نہیں کرنا چاہئیے ۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہمیشہ معاملات کو عارضی انداز ہی میں چلایا ، اور اپنے دل کی بات کے بارے میں کبھی کسی کو ہوا بھی نہ لگنے دی ۔ جنرل چشتی وہ جرنیل تھے جنہوں نے ۴ – جولائی ۱۹۷۷ء کی شب برپا ہونے والے انقلاب میں بلاشبہ کلیدی کردار ادا کیا ۔ یہ جنرل چشتی ہی تھے جنہوں نے تمام سیاسی رہنماؤں کی گرفتاری اور حفاظتی نظر بندی کا انتظام کیا ۔ انٹر سروسز پبلک ریلیشنز کے سابق ڈائریکٹر بریگیڈیر تفضل حسین صدیقی کے بقول ۴ – جولائی کی شب جب تک جنرل چشتی نے آکر یہ اطلاع نہیں دے دی کہ :

"مرشد! سب ٹھیک ہو گیا ہے ، اور یہ کہ گھر سمیت تمام رہنماؤں کو گرفتار کیا جا چکا ہے" اس وقت تک جنرل ضیاءالحق کے چہرے پر تردّد اور پریشانی کی لہریں دُور نہیں ہوئیں ۔ جنرل چشتی انہیں ہمیشہ مرشد کہا کرتے اور واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے حتی المقدور اپنے مرشد کی خدمت بھی کی ، لیکن جب ان کے دماغ میں جانشین بننے کا خیال کلبلایا تو جنرل صاحب نے اس صفائی کے ساتھ انہیں نہ صرف فوج بلکہ حکومت سے بھی نکال باہر کیا کہ تمام جاننے والے حیرت زدہ رہ گئے ۔ اسی طرح انہوں نے جنرل سوار خان اور جنرل اقبال خان کو بھی نکال باہر کیا اور کچھ اس شان سے کہ ملک کے ان دونوں نامور جرنیلوں کو اپنی ریٹائرمنٹ کی خبر ہارس اینڈ کیٹل شو دیکھتے ہوئے ملی ۔ بعد میں انہوں نے یہی سلوک جنرل کے ایم ۔ عارف اور جنرل فضل حق سے بھی کیا ۔ جنرل فضل حق وہ واحد جرنیل تھے جنہوں نے اپنی ترقی نہ ہونے پر صدرِ مملکت کو فون کر کے سخت سست بھی سنائیں ، مگر وہ انہیں پورے تحمل کے ساتھ سمجھاتے رہے ۔ اور صرف آٹھ دن میں ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ جنرل فضل حق کو واپس آتے ہی بنی ۔ جنرل

فضل حق شروع میں برطانیہ کے لئے پاکستان کے سفیر بننے کے خواہاں تھے مگر جب صدر نے ان کا یہ مطالبہ مان لیا تو ایک دم انہیں احساس ہوا کہ اس طرح تو میں اصل کھیل ہی سے نکل جاؤں گا ، سو انہوں نے صدر سے دوبارہ ملاقات کر کے اپنے فیصلہ پر نظرثانی کی اجازت مانگی جو صدر نے بکمال "شفقت" دے دی ۔

۱۹۸۰ء میں صدر نے انہیں کہا تھا کہ میں آپ کو چار ستاروں والا جرنیل بنا دوں گا۔ طے یہ پایا کہ جنرل رحیم الدین ، جنرل سوار خان اور جنرل فضل حق کو بیک وقت ترقی دی جائے گی ، لیکن جب موقع آیا تو جنرل فضل حق کا نام ترقی پانے والوں میں شامل نہیں تھا ۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ اس طرح جنرل جیلانی کو بھی ترقی دینا پڑے گی کیونکہ وہ سب سے سینیئر ہیں ۔ دراصل جنرل ضیاءالحق نے اپنی تاش کے پتے کچھ اس مہارت سے ترتیب دیئے کہ ان کے دورِ حکومت کے سخت ترین حصہ میں یعنی ۱۹۸۳ء سے لیکر ۱۹۸۵ء تک ان کے معتمد ترین جرنیل اہم عہدوں پر فروکش ہوں تاکہ جب وہ ریفرنڈم کا ڈول ڈالیں تو پیرپگارا کے الفاظ میں "فرشتوں" کو ووٹ ڈالنے کا پورا پورا موقع مل سکے ۔

اس دور کا آغاز ۶ – جولائی ۱۹۸۳ء سے ہوا جب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹروں کا ایک اہم اجلاس چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی زیرِ صدارت منعقد ہوا ۔ اس اجلاس میں ملک کے آئندہ سیاسی نظام کا خاکہ ترتیب دینے کے لئے جو فیصلے کئے گئے ، ان کی اساس جنرل فضل حق اور جنرل کے ۔ ایم ۔ عارف پر مشتمل ایک کمیٹی کی سفارشات پر رکھی گئی ۔ یہ کمیٹی خاص اسی مقصد کے لئے تشکیل دی گئی اور اسی روز اس کی رپورٹ سامنے آئی تھی ۔ اس کے علاوہ مجلسِ شوریٰ کی ایک کمیٹی بنائی گئی تھی ، اس کی سفارشات بھی آگئیں اور طویل بحث و تمحیص کے بعد طے یہ پایا کہ اب ایک بار پھر انتخابی عمل کی بات کی جائے اور یہ انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر ہوں ۔ جن میں کامیاب ہونے والے امیدواروں پر مشتمل ایک سرکاری جماعت تشکیل دی جائے ۔ جنرل ضیاء اس جماعت کے سربراہ ہوں گے اور آئندہ پانچ سال تک حکمران رہیں گے ۔ کمیٹی نے صدر اور وزیر اعظم کے اختیارات میں توازن پیدا کرنے کی سفارش کرتے ہوئے یہ سفارش بھی کی تھی کہ ۱۹۸۳ء کے اواخر میں بلدیاتی انتخابات منعقد کروانے کے بعد صدرِ مملکت عام انتخابات کا اعلان کر دیں جس کی رو سے ۱۹۸۴ء کے موسم خزاں میں صوبائی اور اس کے چھ ماہ بعد قومی اسمبلیوں کے انتخابات منعقد کروانے اور دو تہائی اکثریت سے ملک کا صدر اور پارٹی کا سربراہ بننے کے بعد جنرل ضیاءالحق مارچ ۱۹۸۶ء میں مارشل لاء اٹھانے اور فوجی وردی اتارنے کا اعلان کر دیں ۔ اس موقع پر جنرل اقبال نے یہ تجویز پیش کی کہ ان انتخابات کے پانچ سال بعد صدرِ مملکت اپنی نگرانی میں انتخابات منعقد کروانے کے بعد صدارت کا عہدہ بھی چھوڑ دیں اور یوں ایک قومی ہیرو کے طور پر ریٹائر ہو جائیں ۔

صدر ضیاءالحق اپنے ان رفقاء کی تجاویز معنی خیز انداز میں سنتے رہے ۔ ظاہر ہے کہ ان تجاویز کی روشنی میں انہیں وردی اتارنے کے علاوہ اپنی اقتدار سے حتمی طور پر علیحدگی کی تاریخ کا اعلان بھی کرنا پڑتا ۔

جو انہیں کسی بھی طور قبول نہیں تھا ۔ وہ جانتے تھے کہ اس طرح کے کسی اعلان کی صورت میں آئندہ پانچ سال تو دور کی بات ہے کوئی انہیں چار دن بھی حکومت نہیں کرنے دے گا ۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جنرل فضل حق ان کی وردی اتروانے کے بعد خود فوج کی سربراہی کے خواب دیکھ رہے ہیں ، تب تک انہیں جنرل عارف پر پورا اعتماد تھا ۔ (یہ الگ بات کہ کوئی تین برس بعد ۱۹۸۶ء میں جنرل عارف نے بھی یہی تجویز دی تو صدر صاحب بھونچکا رہ گئے ۔ انہوں نے اپنے ایک قریبی ساتھی سے دو تین دفعہ دہرا کر کہا ، "مجھے عارف سے یہ امید نہیں تھی ۔")

۳ – اگست ۱۹۸۳ء کو اس پروگرام پر مزید غور کرنے کے لئے اسی نوعیت کا ایک اور اجلاس طلب کیا گیا ۔ اس اجلاس میں بھی یہی باتیں ہوتی رہیں ۔ مگر تب تک صدر خود اپنا پروگرام ترتیب دے چکے تھے ۔ اس پروگرام سے اپنے رفقاء کو آگاہ کرنا تو ایک طرف انہیں اس کی ہوا تک نہ لگنے دی گئی ۔ کہا تو صرف اتنا کہ چودہ اگست کو اس کا اعلان کرنے سے قبل ایک بار پھر مشورہ کریں گے ۔ مگر یہ مشورہ کیے بغیر انہوں نے ۱۲ – اگست کو ملک میں عام انتخابات منعقد کروانے کا اعلان کر دیا ۔ ان انتخابات کے نتیجہ میں ۲۳ – مارچ ۱۹۸۵ء تک ملک میں سِول حکومت قائم کرنے کا مژدہ بھی سنا دیا گیا ۔ چند دن بعد انہوں نے اپنے "رفقاء" پر اظہارِ اعتماد کے لئے سول اور فوجی رفقاء کے دو نمائندوں ، محمود ۔ اے ۔ ہارون اور جنرل جمال سید میاں پر مشتمل ایک سیاسی کمیٹی بھی تشکیل دے ڈالی ۔ اس کمیٹی کی تشکیل اس انداز میں کی گئی جیسے یہ پرانے الیکشن سیل کا نعم البدل ہو ۔ کابینہ میں کمیٹی کی ساخت پر گھنٹہ بھر تک بحث ہوتی رہی ۔ صدر نے کہا :

"میں اس کمیٹی میں ایسے افراد کو شامل کرنا چاہتا ہوں جو وقتی اور ہنگامی سوچوں سے بالاتر ہوں ، جن کی وابستگی صرف پاکستان سے ہو اور جو ہر حال میں ملک کے مفاد کو عزیز تر رکھیں ۔"

اس کے بعد جو مختلف نام زیر غور آئے ان میں ریٹائر شدہ جرنیلوں اقبال خان اور جنرل سوار خان کے علاوہ میاں ممتاز محمد خان دولتانہ ، اسلم خٹک اور خواجہ صفدر کے نام بھی شامل تھے ۔ مگر آخری فیصلہ محمود ۔ اے ۔ ہارون اور جنرل جمال سید میاں کے ناموں پر ہوا ۔ اس کمیٹی کے ذمہ یہ فریضہ لگایا گیا کہ وہ ملک بھر کے انتخابی امیدواروں کا جائیزہ لے کر اہلیت اور نااہلی کے معیار مقرر کرنے کے علاوہ پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ میں ترامیم بھی تجویز کرے ۔ کمیٹی نے اس حوالے سے جو کام کیا ، اس کی رپورٹ صدر مملکت کو پیش کر دی ۔ یہی کام جنرل کے ۔ ایم ۔ عارف کے ذمہ بھی لگایا گیا تھا ، ایک رپورٹ انہوں نے بھی تیار کر لی ۔ مگر جب فیصلہ کا لمحہ آیا تو صدر نے اپنے بعض دوسرے قانونی مشیروں کے مشورے سے ایک اور ہی مسودہ تیار کر کے پیش کر دیا ۔

کمیٹی کا حشر یہ ہوا کہ نومبر میں صدر نے چاروں صوبوں سے تعلق رکھنے والے ایک ایک وزیر کو

کمیٹی کا رکن بنانے کا حکم دے دیا ، ان وزراء میں غلام دستگیر خان بھی شامل تھے ۔ محمود ہارون اس فیصلہ پر ایسے سیخ پا ہوئے کہ استعفیٰ دے کر گھر جا بیٹھے ۔ بعد میں ایک موقعہ پر جنرل جمال سید میاں نے صدر مملکت سے پوچھا ، "جناب یہ تو بتائیے کہ ایسے امیدواروں کا انتخاب کون کرے گا جو آپ کی پارٹی میں شامل ہوں اور جنہیں ہم انتخاب سے پہلے بھی تھوڑی بہت مدد بہم پہنچا سکیں ؟" صدر نے مسکراتے ہوئے کہا:

"میاں صاحب ، چھوڑئیے یہ شعبہ ، میں خود دیکھ لوں گا ۔"

اور یوں عملی طور پر یہ کمیٹی بھی ختم ہو گئی ۔

○

ریفرنڈم

جوں جوں انتخابات کا زمانہ نزدیک آتا گیا ، سیاسی رہنماؤں نے ایک بار پھر جی ایچ کیو کے پھیرے ڈالنے شروع کر دیئے ، انہی دنوں "ضیاء حمایت تحریک" کا شوشہ بھی چھوڑا گیا جو بُری طرح ناکام ہو گیا ۔ ۲۶ – اکتوبر ۱۹۸۴ء کو کراچی کے ایک سیٹھ حسن دادا بھائی نے اپنے ایک اور ساتھی کے ساتھ جنرل جمال سید میاں سے ملاقات کر کے انہیں غلام مصطفےٰ جتوئی کا یہ پیغام پہنچایا کہ وہ صدرِ مملکت سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں ۔ جنرل صاحب کو بتایا گیا کہ اس حوالے سے جنرل کے ۔ ایم ۔ عارف کے ساتھ بھی کم از کم تین مرتبہ رابطہ ہو چکا ہے مگر بیل منڈھے نہیں چڑھی اور اب جتوئی صاحب نے کہا ہے کہ وہ صرف اور صرف جنرل جمال سید میاں ہی کے ذریعہ صدر سے مل سکتے ہیں ۔ جنرل جمال سید میاں سے جتوئی صاحب کی شناسائی الیکشن سیل کے زمانہ میں ہوئی اور بعد میں انہی نے جتوئی صاحب کو اس وقت کے گورنر سندھ جنرل جہانداد سے بھی ملوایا تھا ۔ مگر جتوئی صاحب بوجوہ جنرل جہانداد کی بجائے جنرل جمال سید میاں کے ذریعہ صدر مملکت کے ساتھ ملاقات کے متمنی تھے ۔ جنرل صاحب نے صدر سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ میرا جتوئی صاحب سے براہِ راست رابطہ ہو چکا ہے ۔ اس حوالے سے صدرِ مملکت اور جتوئی صاحب کی ایک خفیہ ملاقات کا بھی بہت چرچا ہوا ، جس کی جتوئی صاحب ہمیشہ تردید کرتے رہے ۔ اس کے بعد ایم آر ڈی نے ایبٹ آباد میں ایئر مارشل اصغر خان کی اقامت گاہ پر اپنا اجلاس منعقد کر کے طویل غور و خوض کے بعد غیر جماعتی الیکشن کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا ۔ اور یوں ایک بار پھر سیاستدانوں نے جنرل ضیاءالحق کا مقصد پورا کرتے ہوئے انہیں کھلا میدان فراہم کر دیا ۔ انہی دنوں جنرل فضل حق نے جو ۲۳ – مارچ ۱۹۸۴ء کو حسب وعدہ چار ستاروں والا جرنیل نہ بنائے جانے پر صدرِ مملکت سے ناراض ہو چکے تھے ، اپنے ایک ذاتی دوست سے کہا کہ ایم آر ڈی کے ان لیڈروں کی اکثریت مختلف حکومتی اداروں کے مخبروں کے زیر اثر ہے اور یہ اسی حقیقت کا کرشمہ ہے کہ صدر مملکت نے اپنے ان مخالفین سے بھی اپنے حق میں فیصلہ کروا لیا ہے ۔ ادھر جنرل صاحب نے ۱۹ – دسمبر کو ریفرنڈم منعقد کروانے کا اعلان کر دیا ۔ اس ریفرنڈم میں سوال یہ تھا کہ کیا آپ

صدر ضیاءالحق کی طرف سے اسلام نافذ کرنے کی کوششوں کی تائید کرتے ہیں ۔ "ہاں" کی صورت میں جواب کا مطلب یہ تھا کہ صدر جنرل محمد ضیاءالحق آئندہ پانچ سال کے لئے ملک کے صدر رہیں گے ۔

۱۹ – دسمبر کو منعقد ہونے والا یہ ریفرنڈم بھی ایک عجیب تماشا تھا ۔ ایم آر ڈی کی جماعتوں نے اس کے بائیکاٹ کی اپیل کر رکھی تھی اور ملک بھر کے پولنگ سٹیشن بیوہ کی مانگ کی طرح اجڑے ہوئے تھے ، مگر جب نتیجہ آیا تو صدر ضیاء الحق جیت چکے تھے ۔ اور ان کے بقول ، ملک کی کثیر آبادی نے اُنہیں آئندہ پانچ سال کے لیے صدر منتخب کر لیا تھا ۔

بعد میں ایک موقعہ پر جب صدرِ مملکت نے دوبارہ ریفرنڈم کرانے کا فیصلہ کیا تو میں نے صوبہ سرحد کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ جنرل فضل حق سے اس سلسلے میں استفسار کیا ۔ اسلام آباد کے فرنٹیئر ہاؤس میں بیٹھے ہوئے جنرل فضل حق نے جواب دیا :

"میں نے صدر صاحب سے کہہ دیا ہے کہ اب یہ ڈرامہ نہیں چلے گا ۔ پچھلی مرتبہ تو ایم آر ڈی نے بائیکاٹ کر دیا اور ہمیں یک طرفہ دھاندلی کے ذریعہ ووٹوں کے صندوقچے بھرنے کا موقع مل گیا تھا ۔ مگر اب کی بار وہ لازماً منفی ووٹ ڈالنے آئیں گے اور آپ ہار جائیں گے ۔"

جنرل فضل حق کی اس تصدیق کے بعد صدرِ مملکت کی حمایت میں ہونے والے اس ریفرنڈم کے بارے میں کم از کم میرے دل میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا ۔

اس ریفرنڈم کے دوران اُنہیں غیر جماعتی امیدواروں کی حمایت بھی حاصل رہی ۔ تمام امیدوار ایک سے بڑھ کر ایک ، کاروائی ڈالنے کی فکر میں تھے اور جو ووٹ پڑے ، ان میں کچھ نہ کچھ حصہ ان امیدواروں کی کاوشوں کا بھی تھا ، جو کسی نہ کسی طور ملک کے "آئینی سربراہ" کی آشیر واد ضرور حاصل کر لینا چاہتے تھے ۔

.....○.....

وزیر اعظم ، وزرا اعلیٰ اور وزراء کا انتخاب

فروری ۱۹۸۵ء میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابی نتائج سامنے آتے ہی جنرل صاحب نے کامیاب ہونے والے امیدواروں کے بارے میں مختلف ذرائع سے جو معلومات حاصل کیں ، اُن کے نتیجہ میں ایک بات کُھل اور کِھل کر سامنے آگئی کہ ان نمائندوں میں اکثریت ایسے افراد کی ہے جو بہرحال حکومت کا ساتھ دیں گے ۔ یوں بھی باقاعدہ سیاسی عمل نہ ہونے کے باعث زیادہ تر ایسے امیدواروں کو منتخب ہونے کا موقع مل گیا تھا جو آئندہ شاید ہی کبھی دوبارہ اسمبلی ہال میں داخل ہو سکیں ۔ اس پر مستزاد یہ کہ کامیاب ہونے والوں کی اکثریت پر کم از کم ایک ایسی بدعنوانی کا الزام ضرور موجود تھا جس کی بناء پر اُن کے انتخاب کو کالعدم قرار دے کر اُنہیں آئندہ انتخاب کے لیے نااہل قرار دیا جاسکتا تھا ۔ اور یہ بدعنوانی انتخابی اخراجات کے حوالے سے تھی ۔ ایک آدھ کے سوا کوئی بھی امیدوار ایسا نہیں تھا جو اس کڑے معیار پر پورا اترتا ہو ۔ اس حوالے سے مقامی اور ضلعی انتظامیہ نے ان نمائیندوں کو صورتِ حالات بتائی تو اکثریت نے ملک کے "منتخب آئینی" صدر کے ساتھ مکمل تعاون کا یقین دلانے میں لمحہ بھر کے تامل کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی ۔

۴ – مارچ ۱۹۸۵ء کی صُبح مارشل لاء ایڈمنسٹریٹروں اور کور کمانڈروں کا ایک اجلاس صدرو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی زیرِ صدارت منعقد ہوا ۔ اس اجلاس سے قبل صدر اپنی آئینی ترامیم کا مسودہ ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ قوم کے سامنے پیش کر چکے تھے ۔ اس لیے جب اُنہوں نے یہ مسودہ بحث اور غور کے لیے اپنے رفقاء کے سامنے پیش کیا تو اُنہوں نے اسے غیر ضروری مشق قرار دیتے ہوئے ، ایجنڈے کی دوسری شق یعنی آئندہ کے لیے کئے جانے والے اقدامات پر غور کرنا زیادہ اہم خیال کیا ۔ صدرِ مملکت نے بتایا کہ وہ موجودہ نظام کو فی الحال مارشل لاء ہی کی نگرانی میں چلانا چاہتے ہیں ۔ اس حوالے سے اُنہوں نے انسانی تخلیق کی بات کرتے ہوئے کہا کہ اس کام کے لیے نو ماہ کا عرصہ درکار ہوتا ہے ۔ سو ہم بھی اس

جمہوری عمل کو صورت پذیر ہونے کے لیے نو ماہ تک اپنی کوکھ میں رکھیں گے ۔ اور مارشل لاء ۳۰ – دسمبر کو اُٹھایا جائے گا ۔ منتخب حکومت کی سربراہی کے لیے جو مختلف نام زیر غور آئے ، ان میں نواب زادہ عبدالغفور خان ہوتی ، محمد اسلم خان خٹک ، میر ظفر اللہ خان جمالی ، الٰہی بخش سومرو ، مخدوم زادہ حسن محمود اور سید حامد رضا گیلانی شامل تھے ، لیکن طویل بحث کے بعد صدر نے اپنے رفقاء کو بتایا کہ وہ وزیر اعظم کا انتخاب سندھ سے کرنا چاہتے ہیں ۔ اس حوالے سے اُنہوں نے یہ بھی بتایا کہ پیر صاحب پگارا سینٹ کے رُکن منتخب ہو جائیں گے ۔ تب کسی نے تجویز پیش کی کہ اُنہیں چیئرمین سینٹ بنایا جاسکتا ہے مگر اس تجویز کو جلد ہی ترک کر دیا گیا اور سینٹ کے انتخابات کی بات شروع ہو گئی ۔ صدر نے گورنروں کو بتایا کہ وہ فلاں فلاں امیدوار کو ہر حال میں منتخب کروانا چاہتے ہیں ۔ دیگر تمام گورنروں نے اس سلسلہ میں مکمل تعاون کا یقین دلاتے ہوئے یقینی نتائج کی ہامی بھر لی ، مگر صوبہ سرحد کے گورنر لیفٹیننٹ جنرل فضل حق نے سرتاج عزیز کی مخالفت کرتے ہوئے یہ مؤقف اختیار کیا کہ ان پر "لوگ اعتراض کریں گے ۔" اس موقع پر صدر نے نسبتاً سخت لہجہ میں حکم دیا کہ اُنہیں ہر حال منتخب کروایا جائے ۔

اس کے بعد سیاسی جوڑ توڑ کا سلسلہ شروع ہوا ۔ خود مسلم لیگ ، جس کے ساتھ جنرل صاحب کی بات ہو چکی تھی ، اس میں بھی دو دھڑے بن چکے تھے ۔ خواجہ صفدر اور بعض دیگر زعماء پیر صاحب پگارا کی بالادستی کے مخالف تھے جب کہ پیر صاحب پگارا اور صدر ضیاءالحق میں باہمی تعاون کا سلسلہ اب کافی پُرانا اور مضبوط ہو چکا تھا ۔ پیر صاحب نے یہ مؤقف اختیار کر لیا کہ اگر وزیر اعظم کسی اور صوبہ سے لیا جائے تو جسے چاہے منتخب کر لیں ، ہمیں کوئی اعتراض نہیں ۔ لیکن اگر وزیر اعظم کا تعلق سندھ سے ہوگا تو وہ ہمارا آدمی ہو گا ۔ اس حوالے سے اُنہوں نے محمد خان جونیجو کا نام بھی دے دیا ۔ اور آخر کار صدر صاحب نے بھی اس کی منظوری دے دی ۔ اس سے قبل وہ الٰہی بخش سومرو کو بھی اسی نوعیت کا اشارہ دے چکے تھے ۔ اس لیے الٰہی بخش سے رابطہ کر کے اُنہیں کہہ دیا کہ آپ پیر صاحب کو آمادہ کر لیں ۔ باقی کام میں خود کر لوں گا ۔ اور واقعہ یہ ہے کہ الٰہی بخش سومرو کو صدر مملکت نے عین اُس وقت پیر صاحب کے پاس بھیجا جب وہ خود پنجاب سے تعلق رکھنے والے اراکینِ اسمبلی کو محمد خان جونیجو کے بارے میں اپنے فیصلہ سے آگاہ کر رہے تھے ۔ ۲۴ – مارچ کو ایک بار پھر مارشل لاء ایڈمنسٹریٹروں کا اجلاس منعقد ہوا جس میں چیئرمین سینٹ کے بارے میں غور کیا گیا ۔ صدر ، خواجہ صفدر کی شکست اور سید فخرامام کے سپیکر منتخب ہونے پر سخت برافروختہ تھے ۔ ان کے بقول ، اُنہوں نے فخرامام سے بات بھی کی تھی ، مگر تب دیر ہو چکی تھی ۔ اس موقعہ پر اُنہوں نے خواجہ صفدر کے بارے میں سخت تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اُنہوں نے اپنی فتح کے بارے میں پورا یقین نہ دلایا ہوتا تو میں یہ معاملہ بھی خود دیکھ لیتا ۔ اس موقع پر وزراء اعلیٰ اور وفاقی وزراء کے ناموں پر بھی غور کیا گیا اور طے پایا کہ صوبہ سرحد میں ارباب محمد جہانگیر خان ، سندھ میں اعجاز علی تالپور ، بلوچستان میں جام میر غلام قادر خان اور پنجاب میں نواز شریف وزیرِاعلیٰ ہوں گے ۔ مگر آخر کار پیر صاحب پگارا ایک بار پھر سندھ کے حوالے سے اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو گئے اور سید

جنرل ضیاءالحق نے ۱۹۸۵ء میں عام انتخابات منعقد کرانے کا اعلان اپنی نامزد کردہ شوریٰ میں کیا ۔۔ ۱۲ اگست ۱۹۸۳ء

غوث علی شاہ کو سندھ کا وزیراعلیٰ نامزد کرنے کے بعد اُنہیں ایک صوبائی نشست خالی کروا کے کامیاب کرایا گیا ۔

وفاقی وزراء کے حوالے سے خاقان عباسی ، جنرل مجید ملک ، چودھری شجاعت حسین ، بریگیڈیر ریٹائرڈ محمد اصغر ، ملک محمد اسلم آف شمس آباد ، رائے عارف حسین ، اقبال احمد خان ، رائے منصب علی خان ، سید یوسف رضا گیلانی ، میر بلخ شیر مزاری ، پرنس محی الدین بلوچ ، میر حاجی ترین ، میر احمد نواز بگتی ، ڈاکٹر مس نور جہاں پانے زئی ، محمد اسلم خان خٹک ، نواب زادہ عبدالغفور خان ہوتی ، سید قاسم شاہ ، یونس الٰہی سیٹھی ، قاضی عبدالمجید عابد ، عبدالحمید جتوئی ، سردار غلام محمد میہڑ ، زین نورانی اور حاجی حنیف طیب کے ناموں کی منظوری دی گئی ۔ صدر نے اپنے رفقاء سے کہا کہ وہ محمد خان جونیجو کو ان فیصلوں سے خود آگاہ کر دیں گے ۔

وزیرِاعظم کے ذاتی سٹاف کا معاملہ پیش آیا تو اُنہوں نے کیپٹن عیسانی کا نام دیا جسے صدر نے جنرل فضل حق کی مخالفت کے باوجود منظور کر لیا ۔

..... ○ .....

جنرل صاحب کا حلقۂ انتخاب

سِول حکومت کے قیام اور اس حکومت کے ساتھ جنرل صاحب کے تعلقات کا جائزہ لینے سے قبل چند حقائق بہرحال ذہن میں رکھے جانے چاہئیں اور ان میں سرفہرست یہ حقیقت ہے کہ جنرل صاحب نے ۳۰ – دسمبر تک تو خیر مارشل لاء کا چھاتہ ہی تانے رکھا ، مگر اس کے بعد بھی اُنہوں نے کبھی مکمل اقتدار سِول حکومت کے حوالے نہیں کیا ۔ وہ اسے ہمیشہ اشتراکِ اقتدار ہی کا نام دیتے رہے اور ایک سے زیادہ مواقع پر اُنہوں نے قوم کے منتخب نمائندوں کو وعید کے انداز میں سمجھایا کہ "آپ لوگ ٹھنڈی کرکے کھائیں ۔" اس حوالے سے اُنہیں سب سے زیادہ اعتماد خود اپنے حلقۂ انتخاب یعنی فوج کے بارے میں تھا ۔ اور یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ محمد خان جونیجو کو اُسی وقت نکال باہر کیا گیا ، جب اُنہوں نے فوج میں اپنے پاؤں جمانے کی کوشش کی ۔ یہ وہ جرم تھا جو جنرل صاحب کبھی معاف کرنے پر تیار نہیں تھے ۔ جنرل کے ۔ ایم ۔ عارف ان کے قدیم ترین رفیق تھے اور صدرِ مملکت نے بطور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہمیشہ اُنہیں قریب ترین معتمد کی حیثیت دی ۔ لیکن ۱۹۸۶ء کے اواخر میں جب ایک اعلیٰ سطحی اجلاس کے دوران جب جنرل عارف کے منہ سے یہ فقرہ نکل گیا کہ "فوج کو اب ایک کُل وقتی ، پیشہ ور چیف آف آرمی سٹاف کی ضرورت ہے ۔" تو جنرل صاحب نے اپنے بعض ساتھیوں سے گلہ کے انداز میں کہا "مجھے عارف سے ایسی امید ہرگز نہیں تھی ۔" جنرل عارف کو اُنہوں نے بالواسطہ طور پر کسی دوست ہی کے ذریعہ یہ تجویز بھی کروایا کہ وہ صدر کے پاس جاکر وضاحت کر دیں کہ ،

"جناب میرا مطلب یہ نہیں تھا ۔"

مگر جنرل عارف کے بقول اُنہوں نے محض ایک آئینی بات کہی تھی ۔ اس کے بعد اُنہوں نے اس وقت کے وزیراعظم محمد خان جونیجو کو جو وزیر دفاع بھی تھے ، فوجی مشقیں دیکھنے کی دعوت بھجوا دی ۔ یہ گویا جلتی پر تیل ڈالنے کے مترادف تھا ۔ اس وقت صدرِ مملکت کو یاد آیا کہ ان کے ایک رفیق اختر

عبدالرحمن نے تو ۳۰ – دسمبر ۱۹۸۵ء کی شام مارشل لاء اٹھنے کے بعد ہی یہ کہہ دیا تھا کہ "سر! آج آپ نے عارف کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک نہیں دیکھی؟" تب صدر نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی مگر اب یہ بات بھی اُنہیں بڑی بات دکھائی دینے لگی ۔ ادھر جنرل عارف کا بطور دانشور بطور شاعر اور بطور ایک نسبتاً آزاد خیال جنرل کے شہرہ تھا کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا ۔ ستم بالائے ستم یہ کہ محمد خان جونیجو نے کسی محفل میں جنرل عارف کو "بہترین پیشہ ور جرنیل" کے الفاظ سے یاد کر لیا ۔ جولائی ۱۹۸۶ء میں دورۂ امریکہ کے دوران جس طرح وزیر اعظم محمد خان جونیجو کی پذیرائی ہوئی اس سے جنرل عارف اور محمد خان جونیجو دونوں ایک ہی نتیجہ پر پہنچے کہ امریکہ نے پاکستان کی منتخب حکومت کو دل سے تسلیم کر کے آئندہ پانچ سال کے لیے لین او سی دے دیا ہے ۔ اس دورہ کے دوران کسی ایک موقع پر اشارے یا کنائے میں بھی جنرل ضیاءالحق کا تذکرہ نہیں آیا ۔ گویا جنرل صاحب کو خارجہ امور سے بھی نکال باہر کرنے کی کوشش شروع کر دی گئی ۔ حالانکہ یہ بات وہ تقریباً طے سمجھتے تھے کہ دفاع اور خارجہ امور میں اُن کی بالادستی کو کبھی چیلنج نہیں کیا جائے گا ۔

صدر نے اُسی وقت فیصلہ کر لیا کہ اب وہ جنرل عارف کو فوج میں نہیں رہنے دیں گے ۔ نتیجہ یہ کہ ۱۶ – مارچ کی شام اُنہیں پشاور سے اچانک بُلا کر آگاہ کر دیا گیا کہ وہ پانچ دن کے اندر اندر پیک اپ کر لیں ۔ حالانکہ وہ ۲۹ – مارچ کو چین جانے والے تھے ۔ اس موقع پر جنرل ضیاءالحق اور محمد خان جونیجو کے درمیان پہلا بڑا اختلاف پیدا ہوا ۔ جنرل صاحب کی خواہش تھی کہ کے ایم عارف کی جگہ جنرل زاہد علی اکبر کو وائس چیف آف آرمی سٹاف بنایا جائے ، مگر محمد خان جونیجو نے بغیر دیکھے یہ کہہ دیا کہ جو سینیئر ترین افسر ہو گا ، اُسی کو بنایا جائے گا ۔ فائلیں منگوائی گئیں تو معلوم ہوا کہ مرزا اسلم بیگ سینیئر ترین جرنیل ہیں ۔ سو دو بڑوں کی اس سیاسی لڑائی کا فائدہ یہ ہوا کہ ایک فوج کو یک مدت کے بعد ایسا پیشہ ور وائس چیف آف آرمی سٹاف میسر آ گیا جس کی کوئی سیاسی وابستگیاں نہیں تھیں اور جس کا HAJAM NUT سے کوئی تعلق نہیں تھا ۔

دراصل جنرل ضیاءالحق فوج میں جنرل اختر عبدالرحمن اور جنرل مجیب الرحمن جیسے ساتھیوں کو اعلیٰ عہدہ پر فائز رکھنا چاہتے تھے ۔ جن پر وہ مکمل اعتماد کر سکیں ۔ جنرل تجمل جنہیں ۲۶ – اکتوبر ۱۹۸۸ء کی شام آٹھ برسوں بعد جی ایچ کیو کی باضابطہ منظوری اور معافی سے رہائی نصیب ہوئی ، ان کا قصور بھی محض اتنا تھا کہ اُنہوں نے مبینہ طور پر اسلام اور نظریۂ پاکستان کی حمایت میں بھٹو پر تنقید کی ۔ اس تنقید کی رپورٹ ان کے کرنل سٹاف کے ذریعہ جنرل ضیاءالحق تک پہنچی تو انہوں نے جنرل تجمل کو فوج سے نکال باہر کیا ۔ بعد میں ان کے ایک بیٹے کی مبینہ سازش کی اطلاع جنرل مجیب الرحمن کو ملی جس کے مطابق اس سازش کا مقصد جنرل ضیاءالحق کی زندگی ختم کرنا تھا ۔ جنرل مجیب الرحمن نے فوری طور پر صدرِ مملکت کو اطلاع دی ۔ جنرل تجمل قید کر دیئے گئے اور جنرل مجیب الرحمن کو تمغہ مل گیا ۔

جرنیلوں کی اپنے ساتھ ذاتی وفاداری کے بارے میں وہ کوئی سارخنہ برداشت کرنے کے لیے کبھی تیار نہ ہوسکے ۔ اس حوالے سے ایک دلچسپ واقعہ منگلا کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل اعجاز عظیم کی فوج سے سبکدوشی کا بھی تھا ۔ جنرل ضیاءالحق کی عظیم خاندان کے بزرگ سربراہ سردار عظیم سے پرانی نیازمندی چلی آرہی تھی اور وہ جب بھی جہلم یا منگلا جاتے ، لازمی طور پر سردار عظیم صاحب کو سلام کرنے جاتے ۔ سردار عظیم صاحب کے تمام بیٹے فوج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے ۔ ان کے ایک صاحب زادے اعتزاز عظیم کی شادی مرحوم خان عبدالقیوم خان کی صاحبزادی سے ہوئی تھی ۔ خان قیوم جب بھٹو دور میں وزیرِداخلہ ہوئے تو کسی تقریب میں ان کے نواسوں اور سردار عظیم کے پوتوں نے بھٹو صاحب کو پھولوں کا گلدستہ پیش کیا ۔ اپنے دونوں پوتوں کی بھٹو صاحب کو گلدستہ پیش کرنے کی تصویر سردار عظیم نے اپنی خاندانی لال کوٹھی کے ڈرائینگ روم میں آویزاں کر رکھی تھی ۔ بھٹو صاحب کی سبکدوشی اور اُنہیں سزائے موت ملنے کے بعد جنرل ضیاءالحق جب بھی وہاں گئے ، ظاہر ہے کہ ان کے ملٹری سیکرٹری پہلے ہی سے ان کی آمد کے بارے میں اطلاع دے دیتے رہے ۔ نتیجہ یہ کہ ان کی آمد سے فوراً قبل یہ تصویر ڈرائینگ روم کی دیوار سے اتار دی جاتی ۔ ایک بار جنرل صاحب اچانک بغیر اطلاع کے وہاں پہنچے تو یہ تصویر دیوار پر موجود تھی ۔ تصویر دیکھ کر ان کا چہرہ لمحہ بھر کو متغیر ہوا ، مگر انہوں نے فوراً خود پر قابو پایا ۔ سردار عظیم سے ملے ، حال احوال پوچھا اور واپس آ گئے ۔

اگلے ہفتے اُنہوں نے سردار صاحب کے صاحب زادے اور منگلا کے کورکمانڈر جنرل اعجاز عظیم کو ملاقات کے لیے بلایا اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد کہا :

"اعجاز ! میرے پاس آپ کے لیے ایک بڑی شاندار پوزیشن ہے ، آپ تین سال کے لیے سفیر بن کر امریکہ جا سکتے ہیں ۔"

اعجاز عظیم نے پوچھا ، "مگر جناب میری فوجی ملازمت کا کیا ہو گا ؟"

"کچھ بھی نہیں ہوگا ، آپ تین سال بعد واپس آکر دوبارہ JOIN کر سکتے ہیں" جنرل صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ۔ جنرل اعجاز عظیم خوش خوش گھر آئے اور امریکہ جانے کی تیاری شروع کر دی ۔ وہ امریکہ کے لیے روانہ ہونے ہی والے تھے کہ انہیں فوج سے اپنی سبکدوشی کا پروانہ مل گیا ۔ اُنہوں نے فوراً جنرل ضیاءالحق سے رابطہ قائم کیا اور پوچھا کہ "جناب یہ کیا ہے ۔"

صدر نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا ۔

"آئی ایم ویری سوری اعجاز ! اصل میں ہوا یہ تھا کہ امریکیوں نے ایک حاضر سروس جرنیل کو سفیر ماننے سے انکار کر دیا ، دراصل ان کا قانون ہی ایسا ہے ، وش یو گڈ لک ۔"

ٹیلی فون بند ہو گیا اور سابق لیفٹیننٹ جنرل اعجاز عظیم اپنی سفارتی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے امریکہ روانہ ہو گئے ۔

.....○.....

جمہوری تماشا

۲۳ - مارچ ۱۹۸۵ء کو صدر جنرل محمد ضیاءالحق کی زیرِ نگرانی جس جمہوری دور کا آغاز کیا گیا ۔ اس کے بارے میں واقفانِ حال پہلے ہی روز سے جانتے تھے کہ یہ محض "شراکتِ اقتدار" ہے ۔ اس شراکتِ اقتدار کو قانونی اور آئینی تحفظ دینے کے لیے صدر نے اپنے آر سی او ہی میں پورا انتظام کر دیا تھا اور جو کچھ کسر رہ گئی اسے آٹھویں آئینی ترمیم کے ذریعہ پورا کر لیا گیا ۔ وفاقی کابینہ اکثر و بیشتر انہی افراد پر مشتمل تھی جن کے نام صدر ضیاء الحق اور ان کے عسکری رفقاء نے منظور کیے تھے ۔ صوبائی حکومتیں بھی انہیں کی نامزد کردہ تھیں اور پالیسی کے طور پر صدر نے یہ بات طے کر رکھی تھی کہ اس جمہوری تجربہ کے دوران وہ اپنی تمام کاروائیاں صوبائی حکومتوں ہی کے ذریعہ بروئے کار لائیں گے ۔ اب یہ بات شاید لطیفہ ہی محسوس ہو مگر اس وقت کیفیت یہ تھی کہ وفاقی حکومت کے پاس اول تو کوئی اختیار تھا نہیں اور جہاں تہاں تھوڑی بہت بات بن سکتی تھی وہاں صدرِ مملکت نے اپنے خصوصی مُہرے فِٹ کر رکھے تھے ۔ وزارتِ خزانہ ڈاکٹر محبوب الحق کی عملداری میں تھی تو وزارتِ عدل و پارلیمانی امور صدرِ مملکت کی نامزد شوریٰ کے ایک رُکن اقبال احمد خان کے سپرد تھی ۔ پٹرولیم اور قدرتی وسائل کے وزیر ڈاکٹر اسد کو بھی صدر ہی امریکہ سے لائے تھے ۔ داخلہ امور کے وزیر اسلم خٹک بھی شوریٰ کے ساتھیوں میں سے تھے ۔ اطّلاعات کا محکمہ حامد ناصر چٹھہ کو اس لیے سونپا گیا کہ وہ بھی مارشل لاء دور کے صوبائی وزیر رہ چکے تھے، مگر جب انہوں نے اس شعبہ میں نسبتاً آزادہ روی کا رویہ اپنایا تو اُنہیں چلتا کر دیا گیا ۔ داخلہ امور سے اسلم خٹک نکلے تو نسیم آہیر آ گئے، غرض تمام حساس محکموں کو صدر نے براہِ راست اپنے انتداب میں رکھا ہوا تھا ۔ اور یہ وزراء وزیر اعظم کی بجائے صدر کے اشاروں پر معاملات کو آگے بڑھا رہے تھے ۔ ڈاکٹر محبوب الحق ، میر ظفراللہ جمالی اور نواب زادہ عبدالغفور خان ہوتی، مارشل لاء دور میں بھی صدر کی کابینہ میں شامل رہے اور صدر کے طریقۂ کار سے مکمل طور پر ہم آہنگ تھے، اس لیے وفاق کی سطح پر معاملات اپنی مرضی کے مطابق چلانے میں اُنہیں کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی ۔ رہے قومی اسمبلی اور سینٹ کے ادارے جنہیں اصولاً اپنے منتخب وزیرِ اعظم کا پشت

پناہ ہونا چاہیئے تھا تو ان کی کیفیت یہ تھی کہ اکثریت صوبائی وزراعلیٰ کے احکام کی بجاآوری میں مصروف رہتی، کیونکہ اختیارات اور اقتدار تو تمامتر صوبائی حکومتوں کے ہاتھ میں تھے ۔ پچاس لاکھ روپے فی رکن کے ترقیاتی منصوبوں کا جو ڈھول جونیجو حکومت کی برطرفی کے بعد پیٹا گیا، اس کی حقیقت یہ تھی کہ مرکزی حکومت محض منصوبوں کی کاغذی منظوری دے سکتی تھی ۔ ان پر عمل درآمد بہرحال صوبائی حکومتوں ہی کے ذریعہ ہوتا اور صوبائی حکومتیں خود اپنے ہی وزیراعظم کے باغیوں کی پناہ گاہیں بنی ہوئی تھیں ۔ وزیراعظم کو وفاقی ایوانوں میں سے بھی جب کبھی ووٹ لینا پڑا، صوبائی حکمرانوں کے ذریعہ لیا گیا ۔ صوبہ سرحد کے اُس وقت کے گورنر فضل حق نے تو وزیراعظم کو باقاعدہ یہ احساس دلوا دیا تھا کہ ان کی مرضی کے بغیر صوبہ سرحد کا پتّا بھی نہیں ہل سکتا ۔ مسلم لیگ کی رُکنیت سازی کا معاملہ آیا اور وزیراعظم صوبہ سرحد گئے تو اراکین کی اکثریت نے مسلم لیگ پر رکھ کر اُنہیں ایسی سخت سست سنائیں کہ وزیراعظم کو بات ہی کرنے کی ہمت نہ ہو ئی ، جنرل فضلِ حق بھی اس موقعہ پر موجود تھے مگر اُنہوں نے اپنے وزیراعظم کے حق میں ایک لفظ تک کہنے کی ضرورت محسوس نہ کی ۔ چند دنوں بعد یہی جنرل فضلِ حق خود اسلام آباد آئے ، فرنٹیئر ہاؤس میں صوبہ سرحد کے اراکینِ اسمبلی و سینٹ کو طلب کیا اور بیک بینی و دو گوش وزیراعظم کے حوالے کر دیا کہ مسلم لیگ میں جب اور جیسے چاہیں شامل کر لیں ۔ گویا وزیراعظم کو یہ احساس دلا دیا گیا کہ ان کی حیثیت ایک تابعِ مہمل سے زیادہ کچھ نہیں ۔

چشمہ رائٹ بنک کینال کے پانی کا مسئلہ در پیش ہوا تو پنجاب اور سرحد کی حکومتوں نے قومی اسمبلی کی لابیوں میں وہ اودھم مچایا کہ الامان ۔ صوبائی وزراء خود اپنی پارٹی کی حکومت کے وفاقی وزیر کی پالیسیوں کے خلاف لابی کرنے اسلام آ پہنچے اور اس شان سے کہ وزیراعظم کو مداخلت تک کی ہمت نہ ہوئی ۔ وزیراعظم پشاور گئے تو گورنر ہاؤس کی ضیافت میں اُنہیں اتنی تند و ترش باتیں سننا پڑیں کہ میر ظفراللہ جمالی احتجاجاً کھانا چھوڑ کر باہر نکل گئے ۔ پنجاب کے وزیراعلیٰ نواز شریف ، صدرِ مملکت اور آزاد کشمیر کے سردار عبدالقیوم خان کے ساتھ مل کر وفاقی حکومت کو کمزور سے کمزور تر کرنے میں مصروف رہے ۔ سول حکومت کے "گاڈ فادر" پیر صاحب پگارا نے اُنہیں للکارا تو انہوں نے عملاً پیر صاحب کا منہ بھی چڑا دیا اور کُھل کر میدان میں آ گئے ۔ محمد خان جونیجو نے بھی دیکھا کہ معاملہ کمزور ہے، سو اُنہوں نے نہ صرف نواز شریف کی حمایت کی بلکہ پیر صاحب کا ساتھ دینے سے بھی گریز کیا ۔ اس سب پر مستزاد یہ کہ صدرِ مملکت لاہور گئے اور ائیر پورٹ پر اخبار نویسوں سے گفتگو کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ نواز شریف نے اپنا کِلّا مضبوطی سے گاڑ رکھا ہے اور واقعی یہ کِلّا اتنی مضبوطی سے گڑا ہوا تھا کہ محمد خان جونیجو کی برطرفی اور منتخب اداروں کو توڑ دیئے جانے کے باوجود نواز شریف پنجاب کے حکمران رہے ۔

صوبہ سرحد میں صدر کے دستِ راست جنرل فضلِ حق نے جب ضرورت سے زیادہ دانت دکھانا شروع کئے تو کچھ دن کے لئے انہیں گھر بھجوا دیا گیا، مگر جب ان کے دروازے سے حفاظتی گارد ہٹائی گئی تو

جنرل ضیاءالحق اپنے پانچ سالہ اقتدار کے لئے ریفرنڈم کا اعلان کر رہے ہیں ۔۔ یکم دسمبر ۱۹۸۴ء

وہ سیدھے صدر کے پاس پہنچے، گلے شکوے ہوئے، اور پھر جب گلے سے مل گئے، سارا گِلا جاتا رہا ۔ فضلِ حق سینیٹر تھے، اور جمہوری اداروں کی رخصتی کے بعد انہیں ایک بار پھر وزیراعلیٰ بنا دیا گیا ۔

سید غوث علی شاہ چونکہ براہِ راست صدر کے آدمی نہیں تھے اس لیے وہ کبھی کبھار غچہ بھی دے جاتے ۔ انہیں خود محمد خان جونیجو کے ہاتھوں فارغ کروا دیا گیا ۔ صوبہ بلوچستان کے وزیر اعلیٰ جام میر غلام قادر خان مرحوم مرنجان مرنج آدمی تھے ۔ وہ باغبان اور صیاد دونوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے رہے ۔ نتیجہ یہ کہ جب اسمبلیاں توڑی گئیں تو انہیں دوبارہ وزیر اعلیٰ نہیں بنایا گیا ۔ پہلے تو صدر نے انہیں ملاقات کے لئے طلب کیا ۔ اور کہا کہ آپ آج ہی کوئٹہ جا کر وزارتِ اعلیٰ کا حلف لے لیں، پھر کہا کہ جناب آپ کے خلاف تو بدعنوانی کے الزامات ہیں ۔ جام صاحب نے ایک دنیا دیکھ رکھی تھی اور بہت کم غصہ میں آتے تھے مگر خود اُنہی کے بقول اُس روز اُنہیں غصہ آگیا، اُنہوں نے کہا:

"جنابِ صدر! بے عیب ذات تو یا اللہ تعالیٰ کی ہے یا پھر آپ کی، اس لیے آپ کوئی دوسرا وزیراعلیٰ ڈھونڈ لیں ۔"

یوں یہ معاملہ رہ گیا، اور میر ظفراللہ جمالی کو صوبہ بلوچستان کا وزیراعلیٰ بنا دیا گیا ۔

.....○.....

صدر کے آئندہ ارادے

اس بات پر لازماً مختلف آراء ہو سکتی ہیں کہ جنرل محمد ضیاءالحق کیا شروع ہی سے اپنی دائمی حکومت کے خواہاں تھے یا حالات اور سیاستدانوں نے اُنہیں اس نہج پر سوچنے کی عادت ڈال دی ۔ مگر اس بات میں کسی بھی دانندۂ راز کو رتّی برابر شبہ نہیں ہو سکتا کہ آخر آخر میں وہ اپنی ذات اور پاکستان کو لازم و ملزوم سمجھنے لگے تھے اور اپنے دور میں، اپنے ہاتھوں قائم کر کے، خود ہی توڑ دینے والی پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے اپنے آخری خطاب میں انہوں نے وعید کے انداز میں کہا بھی تھا کہ بیرونِ ملک پاکستان کو ان کی ذات کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے ، اس لیے ان کی قدر کی جانی چاہیئے ، احترام کیا جانا چاہیئے ۔

وہ بلا شبہ ایک زور دار شخصیت تھے، گیارہ برس کوئی معمولی عرصہ نہیں ہوتا ۔ اس عرصے میں بچے جوان اور جوان بوڑھے ہو جاتے ہیں اور جنرل ضیاءالحق نے تو اپنے گیارہ برسوں کے دوران اتنے طوفانی، اتنے پُر آشوب فیصلے کئے کہ اب پیچھے پلٹ کر دیکھیں تو حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح ایک شخص، جی ہاں محض ایک شخص، تن تنہا، پوری قوم کی تقدیر سے حسبِ دلخواہ کھیلنے میں مصروف رہا ۔ جو رفقاء ۴ - جولائی ۱۹۷۷ء کی شب ان کے دست و بازو اور پناہ تھے ۔ اُنہوں نے آہستہ آہستہ کمال صفائی کے ساتھ انہیں بھی رخصت کر دیا اور کچھ اس انداز سے کہ ان لوگوں کی زبانیں آج بھی کم کم ہی کُھلتی ہیں ۔ انہوں نے ہمیشہ فوج کو اپنا حلقۂ انتخاب قرار دیا مگر اس امر میں شمہ برابر شبہ کی بھی گنجائش نہیں کہ وہ گیارہ برس تک عوام سے زیادہ خود فوج کے استحصال میں مصروف رہے ۔ فوج محض چند افراد کا نام تو نہیں، یہ ایک قومی ادارہ ہے ۔ ایک ایسا قومی ادارہ جس کے جیالوں نے ہر کڑے وقت میں ملک و ملت کی پاسبانی کا فریضہ اس اعلان کے ساتھ ادا کیا کہ

سو جاؤ عزیزو کہ فصیلوں پر ہر اک سمت
ہم لوگ ابھی زندۂ و بیدار کھڑے ہیں

جنرل ضیاءالحق گیارہ برس تک اس ادارے کا نام لینے کے باوجود اس کے وقار میں اضافہ نہ کر سکے بلکہ ان کے حوالے سے یہ تاثر گہرا ہوتا چلا گیا کہ وہ اس قومی ادارہ کو ذاتی جاگیر بناتے چلے جا رہے ہیں ۔ انہوں نے ہر حساس مقام کے لیے چُن چُن کر ایسے افراد کا انتخاب کیا جن کا تعلق ان کی جنم بھومی جالندھر سے تھا اور اس پر کراچی کے ایک ہفت روزہ نے کالم بھی لکھا، جس کی سرخی ہی یہ تھی کہ "جالندھر چلو یا پھر اندر چلو" ۔

اسلام سے ان کی وابستگی کے متعلق بھی ہمیشہ بوقلموں باتیں ہوتی رہیں ۔ ایک زمانے میں تو ان پر قادیانی ہونے کا الزام بھی عائد کیا گیا ۔ اپنی ذاتی زندگی میں وہ بلاشبہ ایک پابندِ صوم و صلوٰۃ مسلمان تھے، شروع میں ڈن ہل کے سگریٹ پیا کرتے، مگر ایک بار نورانی میاں نے تعریضاً اس پر پھبتی کستے ہوئے کہا کہ جنرل صاحب ہمیں تو پاکستانی بننے اور پاکستانی چیزیں خریدنے کی تلقین کرتے ہیں اور خود غیر ملکی سگریٹ پیتے ہیں، اس پر انہوں نے سگریٹ پینے کی عادت تیاگ دی اور آخر دم تک اس سے مجتنب رہے ۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام کے نام لیوا جنرل محمد ضیاءالحق کے دور میں اسلام کے نام پر مخالفین کے لیے قید ، کوڑے اور سزائیں ہی میسر آسکیں ۔ یہ اکتوبر ۱۹۷۷ء کی بات ہے جب انہوں نے لاہور کی صوبائی اسمبلی کے آڈیٹوریم میں اخبار نویسوں سے خطاب کرتے ہوئے اشتعال کے عالم میں کہا تھا کہ "میں آپ کو سامنے والے درخت سے الٹا لٹکا دوں گا ۔"

فی الجملہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ سیاست، اہلِ سیاست اور شہری آزادیوں سے سخت نفرت کرتے تھے ۔ ایک آدھ بار جب انہوں نے سیاستدانوں کے ساتھ اقتدار میں شراکت قبول کی بھی تو بادلِ ناخواستہ ہی کی ۔ اور کبھی انہیں دل سے اپنا ہمسر تسلیم نہ کیا ۔ ایک بار تو انہوں نے یہاں تک بھی کہہ دیا تھا کہ اگر آج میں انہیں ہڈی دکھا دوں تو یہ دم ہلاتے ہوئے میرے پیچھے دوڑتے چلے آئیں گے ۔

آئین اور آئینی حکومت کے بارے میں بھی ان کے خیالات کسی سے پوشیدہ نہیں تھے، شروع ہی میں انہوں نے اس قسم کے اشارے دینا شروع کر دیئے تھے جن سے معاملات کو سمجھنا دشوار نہ تھا ۔ ایرانی اخبار "کیہان" کو انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا "آئین کیا ہے؟ محض بارہ صفحات کا کتابچہ، جسے میں جب چاہوں چاک کر کے پھینک دوں ۔"

وہ ہمیشہ اسلام کی بات کرتے رہے مگر آٹھ سال تک آمرِ مطلق رہنے کے باوجود اسلام کے لیے کوئی انقلابی اقدام نہ کیا، اور آج اگر تجزیہ کیا جائے تو احساس ہو گا کہ ان کے دور میں بطور "ایشو" اسلام کو فائدے کی بجائے الٹا نقصان ہی پہنچا ۔

ان کے دور میں علیحدگی پسند قوتوں کو تقویت حاصل ہوئی، سندھ میں احساسِ محرومی پیدا ہوا ۔ بلکہ یوں کہیے کہ سندھ ایک ایسا صوبہ ہے جو صدر ضیاءالحق کے لیے ہمیشہ مصیبت بنا رہا ۔ اور واقعہ یہ ہے

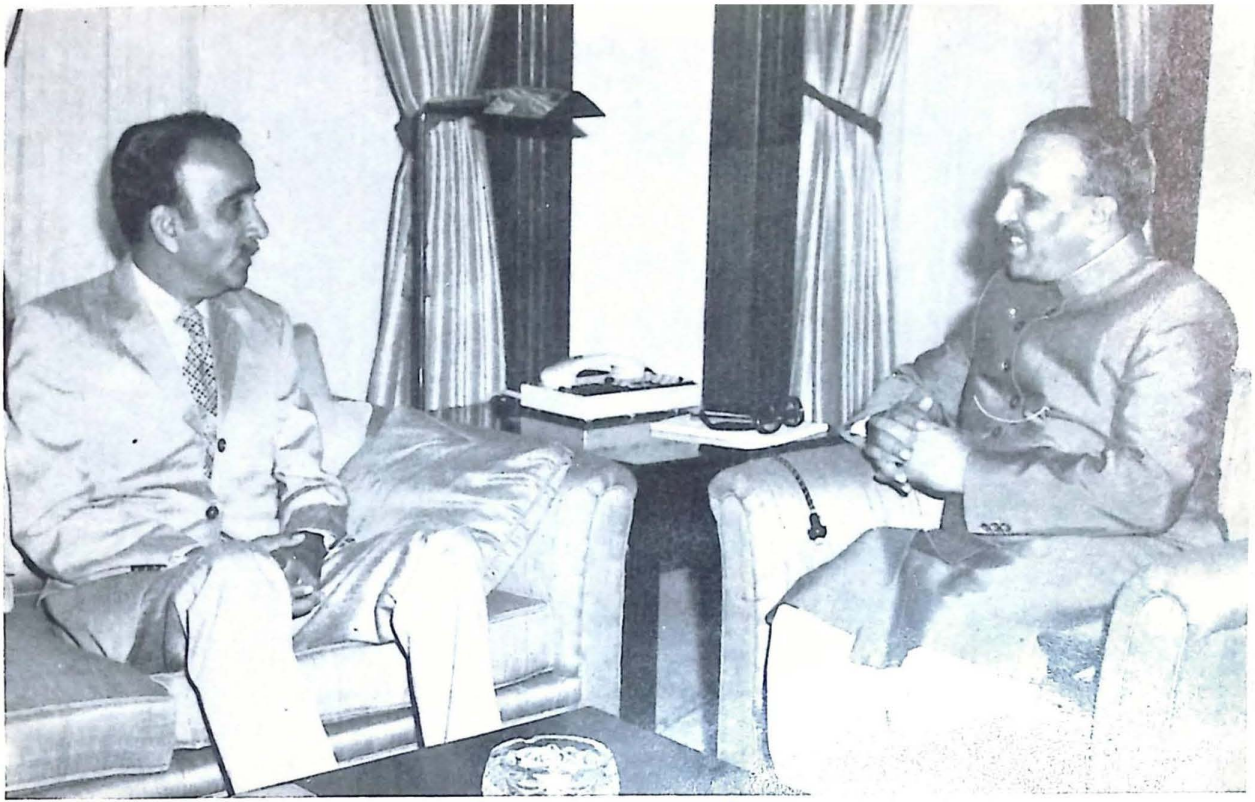

شیر آف پاور ۔۔ صدر جنرل ضیاء الحق، وزیراعظم محمد خان جونیجو کو وزارت عظمیٰ کا چارج دے رہے ہیں ۔۔ ۲۵ مارچ ۱۹۸۵ء

کہ ۱۹۸۳ء میں دادو کے ریسٹ ہاؤس میں عملی طور پر مقید ہو کر رہ جانے والے صدر ضیاءالحق اس کے بعد ایک بار بھی اندرونِ سندھ کے دورہ پر نہیں گئے ۔

۱۹۸۳ء میں ایم آر ڈی کی تحریک کے متعلق صدر ضیاءالحق کا منصوبہ یہ تھا کہ اس تحریک کو ہائی جیک کر لیا جائے اور شروع ہی سے اس میں ایسے افراد شامل کر دیئے جائیں جو اس کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے کر معاملات کو حکومت کی مرضی کے مطابق رُخ دے سکیں ۔

مگر ایسا نہیں ہو سکا، ایم آر ڈی کی تحریک ناکام ہو کر بھی اتنے اثرات ضرور چھوڑ گئی کہ صدر ضیاءالحق کو بہرحال انتخابات کا اعلان کرنا پڑا ۔ ایسا اعلان جس پر عملدرآمد بھی ہوا اور سندھ کی محرومیوں کا مداوا کرنے کے لیے ایک سندھی کو وزیراعظم بھی بنا دیا گیا ۔ مگر دادو ریسٹ ہاؤس میں جس طرح سندھ کے جیالوں نے تمام تر دباؤ کے باوجود جنرل صاحب کو ہیلی کاپٹر تک پہنچنے سے کافی دیر تک روکے رکھا، جس طرح وہ بعض جانوروں کو آگے لگا کر جلوس نکالنے میں مصروف رہے، اور جس قدر پتھراؤ کیا گیا، یہ ساری باتیں صدر ضیاءالحق کو کبھی نہ بھول سکیں ۔

محمد خان جونیجو کو وزیراعظم بنا کر سندھ کی جو اشک شوئی کی گئی تھی، وہ اس لیے بھی کامیاب نہ ہو سکی کہ محمد خان جونیجو اپنی تمام تر کمزوری اور شرافت کے باوجود جنرل ضیاء الحق کے ہاتھ میں کٹھ پتلی نہ بن سکے ۔ انہوں نے معاملات کو حتی المقدور اپنی مرضی کے مطابق چلانے کی کوشش کی۔ صدر ضیاءالحق بار بار انہیں کہتے کہ آپ صرف سندھ پر توجہ دیں مگر جونیجو نے خود کو پورے ملک کا وزیراعظم سمجھنا شروع کر دیا، صدرِ مملکت نے بارہا کہا بھی کہ "میں اسے سندھ جانے کے لیے کہتا ہوں تو یہ سندھڑی جا کر بیٹھ رہتا ہے" مگر محمد خان جونیجو نے اپنے کارڈ پوری چابک دستی سے کھیلنا شروع کر دیئے اور یوں جنرل صاحب کو خود اپنے نامزد کردہ وزیراعظم سے نجات حاصل کرنا پڑی ۔

آخری دنوں میں ان کا ارادہ ایک اور ریفرنڈم منعقد کرانے کا تھا ، جس کے ذریعہ وہ موجودہ "مغربی جمہوری" نظام کو اسلامی نظامِ خلافت میں تبدیل کرنے کے لیے استصوابِ رائے عامہ کرانے والے تھے ۔ اگر جواب ہاں میں ہوتا تو اس کا مطلب یہ لیا جاتا کہ عوام نے صدر جنرل محمد ضیاءالحق کو مزید سات سال کے لیے حکمرانی کرنے کی اجازت دے دی ہے، اس کے بعد ان کا ارادہ ایک بار پھر اپنی مطلب کی مجلسِ شوریٰ نامزد کرنے کا تھا، جس کے ذریعہ عوام پر گرفت مضبوط کی جاتی ۔ یہ گویا ایک طرح کا قومی بلدیاتی ادارہ ہوتا، جس کے ذریعے نالیاں ، پُل اور سڑکیں تعمیر کرنے کے ساتھ ساتھ رائے عامہ کو قابو میں رکھنے کا انتظام کیا جاتا ۔ شاید ایک وزیراعظم بھی نامزد کر لیا جاتا اور صدر کا پروگرام یہ تھا کہ اس وزیراعظم کا فوج، فوجی سربراہوں کی تعیناتی یا ترقی ، صوبائی گورنروں کی تعیناتی، عدلیہ، سول سروس کے افسران کے تقرر و تبادلہ اور امورِ خارجہ سے کوئی تعلق نہیں ہو گا ۔ وہ محض ایک "آئینی" وزیراعظم ہوتا ۔

.... ○ ....

ضیاءازم کا نعرہ

تین سالہ جمہوری تجربہ فی الجملہ "پچھلی غلطیاں معاف، اگلی شروع" کا وقفہ تھا ۔ اور اس سے صدر ضیاءالحق کا واحد مقصد اپنے گزشتہ ایام کے لیے منتخب قومی اداروں کی سندِ جواز یا ویلی ڈیشن حاصل کرنا تھا جو انہیں آٹھویں آئینی ترمیم کی شکل میں میسر آ گئی ۔ اس کے بعد انہوں نے آہستہ آہستہ اپنے پتے کھولنا شروع کئے اور ایک روز خود اپنی بساط پر، خود اپنے ہی لگائے ہوئے مہرے، محمد خان جونیجو کو شہ مات دے دی ۔ یہ داستان چونکہ اکثر و بیشتر میری کتاب 'سندھڑی سے اوجڑی کیمپ تک" میں آ چکی ہے ، اس لئے اس کا یہاں دہرانا محض تحصیلِ حاصل ہو گا ۔ تاہم اتنا ضرور ہے کہ صدر نے اپنا فیصلہ انتہائی جلدی میں کیا اور اس پر جس انداز سے عملدرآمد کیا ، اس نے ان کے عزائم کی گٹھڑی بھرے چوک میں کھول کر رکھ دی ۔

تاریخِ عالم کے طلباء جانتے ہیں کہ جب بھی کسی مستبد اور آمر حکمران نے اقتدار میں شراکت قبول کی، بادلِ ناخواستہ کی اور چاہے کانسٹنٹائن کی طرح سترہ برس بعد موقع ملے ، ایسے حکمران واپس ضرور آئے ہیں ، جنرل ضیاءالحق نے بھی یہی کیا، مگر یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد وہ آئندہ کی منصوبہ بندی نہایت احتیاط سے کرنا چاہتے تھے ۔ انہوں نے اپنے آزمودہ مہروں اور مارشل لاء دور کی ٹیم کو دوبارہ اکٹھا کرنا شروع کیا اور مستقبل کی مہرہ بازی کے لئے بساط بچھانا شروع کی ہی تھی کہ ۱۷ - اگست ۱۹۸۸ء کو اچانک موت نے انہیں اپنی آغوش میں لے لیا ۔ ان کی موت بہاولپور کے نزدیک رونما ہونے والے ایک ہوائی حادثہ کے ذریعہ واقع ہوئی ۔ اسی روز صُبح وہ امریکی سفیر آرنلڈ رافیل سمیت بعض اہم فوجی مشقیں اور اسلحہ دیکھنے بہاولپور گئے تھے ۔ ان کا یہ سفر پاکستان ائیر فورس کے کارگو طیارہ سی ون تھرٹی میں شروع ہوا اور اسی میں ختم ہو گیا ۔ اس طیارہ کا کوڈ نمبر پاکستان ون تھا ۔ اس میں خاص طور سے صدر اور ان کے رفقاء کے لئے کیبن اور نشستیں نصب کی گئی تھیں ۔ اسی طیارے میں وہ چکلالہ سے روانہ ہو کر بہاولپور پہنچے، مگر یہی طیارہ ان

کی واپسی کا ضامن نہ بن سکا ۔ فضاء میں بلند ہوتے ہی اچانک اس کے نظام میں کوئی خرابی پیدا ہوئی، طیارہ ناک کے بل زمین پر گر کر تباہ ہو گیا، تیل کی ٹنکیاں پھٹ گئیں ، آگ چاروں طرف سے اپنے مہیب پنجے پھیلاتی ہوئی بڑھی اور جنرل ضیاءالحق کے ہمراہ ان کے بعض دیرینہ رفقاء خاکسترِ میں تبدیل ہو گئے ۔ کلامِ مجید کے الفاظ میں یہ فاعتبرو یا اولی الابصار کا موقع ہے، جس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے ۔ جنرل ضیاءالحق جب اقتدار میں آئے تو وہ تنہا نہیں تھے، ان کے ساتھ جرنیلوں کا ایک گروہ تھا، جسے انہوں نے آہستہ آہستہ چلتا کیا اور کیفیت یہ ہو گئی کہ

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل، مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

ان کے ابتدائی رفقاء حالات کی پیداوار تھے یا یوں کہیے کہ حالات نے انہیں باہم دگر مجتمع کر دیا تھا، بعد میں انہوں نے اپنے رفقاء کا انتخاب خوب چھان پھٹک کر کیا ۔ یہ رفقاء ان کی سیاسی ریشہ دوانیوں ہی کے ساتھی نہیں تھے ۔ صدر نے ان کے ساتھ اقتدار میں بھی شراکت قبول کر لی تھی اور گھریلو نوعیت کی رشتہ داریوں کے سلسلے بھی دراز سے دراز تر ہوتے چلے جا رہے تھے ۔ انہوں نے آہستہ آہستہ اپنی صدارت کو بادشاہت یا اسلامی اصطلاح کی آڑ لے کر خلافت میں تبدیل کرنا شروع کر دیا تھا ۔ اور اس کی تیاریاں مکمل تھیں ۔ ان کی موت کے بعد ان کے سیاسی پسماندگان نے "ضیاء ازم" کو ایک تحریک بنانے کی اپنی سی کوشش بھی کی مگر سیاسی فیصلوں اور دانش سے محروم قیادت کے باعث یہ تحریک، زیادہ دیر اور زیادہ دور تک نہ چل سکی ۔ آخر کا ضیاءازم کے پسماندگان، محمد خان جونیجو کے دامانِ تار تار میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے ۔

.....○.....

پس چہ باید کرد ؟

ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے خلاف پاکستان قومی اتحاد کی ملک گیر تحریک کے نتیجہ میں ۴ - جولائی ۱۹۷۷ء کی شب مارشل لاء برپا کرنے والے جنرل محمد ضیاءالحق کے بارے میں پہلے روز عام تأثر یہی تھا کہ اُنہوں نے مارشل لاء بھٹو صاحب کے ساتھ مل کر انہیں عوامی غیظ سے بچانے کے لئے نافذ کیا ہے ۔ ۵ - جولائی کی شام قوم کے نام اپنی نشری تقریر میں جنرل صاحب نے خود بھی اس دلچسپ غلط فہمی کا ذکر کیا اور اس کی تردید کر دی ۔ تب ان کا اعلان نوے روز کے اندر الیکشن کرانے اور آپریشن فیئر پلے مکمل کرنے کے بعد بیرکوں میں واپس چلے جانے کا تھا ۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ جنرل صاحب کی نیت اور ارادوں میں تبدیلیاں آتی چلی گئیں شروع میں اُنہوں نے انتخاب سے پہلے احتساب کا نعرہ لگایا ۔ پھر دلائی کیمپ کے اسیروں کو رہا کرکے ان سے ٹیلی ویژن پر ظلم کی داستانیں سنوائیں ۔ بھٹو کے خلاف ایک پرانے مقدمہ کی ایف آئی آر نکلوا کر ان پر مقدمہ چلانے کا اعلان کیا اور کہا کہ وہ ملک میں صاف ستھری جمہوریت کا راستہ ہموار کرنا چاہتے ہیں ۔ اس کے بعد گیارہ سال تک وہ مختلف وقتی فیصلوں کے ذریعہ قوم کو خوش کرتے رہے ۔ کبھی قاضی کورٹوں کی بات کی تو کبھی نفاذِ شریعت کے نام پر من مانے آرڈی ننس جاری کرتے رہے ۔ جنرل صاحب تو اب اس دنیا میں نہیں رہے مگر ان کے اٹارنی جنرل عزیز اے منشی بقیدِ حیات ہیں وہ گواہی دیں گے کہ شریعت آرڈی ننس کے نام پر جو مسودہ دستور پیش کیا گیا وہ محض وقت گزاری کی ایک کوشش تھی ۔ خود منشی صاحب نے اس مسودہ کے اجراء پر راقم الحروف سے کہا تھا کہ جنرل صاحب نے اپنی بلا عدلیہ کے گلے ڈال دی ہے ۔ اب یہ علماء اور جج حضرات پر ہے کہ وہ صورتِ حال سے کیونکر عہدہ برآ ہوتے ہیں ۔

جنرل صاحب کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ کسی بھی اصول یا ضابطے کے ساتھ مخلص نہیں تھے ۔ جن افراد کو انہوں نے شروع میں اپنے "رفقاء" قرار دیا انہیں جب چلتا کرنے کا فیصلہ کیا تو اس صفائی سے نکالا کہ یہ لوگ ۔

ایسے گئے کہ خط بھی نہ بھیجا رسید کا

کی تصویر و تفسیر بن کر رہ گئے ۔ یہ درست ہے کہ جنرل صاحب کو بعض سیاسی رہنماؤں کی ظاہر و باہر اعانت میسر رہی مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کا اپنا ارادہ بھی شروع ہی سے طویل تر قیام کا تھا ۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سیکریٹریٹ کے پرانے عملہ کو یاد ہوگا کہ اگست ۱۹۷۷ء کے پہلے ہفتہ ہی میں سی ایم ایل اے جنرل محمد ضیاءالحق کے لیٹر پیڈ ہزاروں کی تعداد میں چھپوائے گئے اور دیگر سٹیشنری بھی اتنی تیار کروائی گئی جو برسوں کے لئے کافی تھی ۔ یہ منصوبہ بندیاں محض نوے روز کی نہیں تھیں بلکہ معاملہ شروع ہی سے طویل قیام کا تھا ۔ یہ الگ بات کہ جنرل صاحب نے اپنی اس خواہش پر عمل درآمد دوسروں کے ذریعہ کیا ۔ انہوں نے اپنی بندوق سے جتنے بھی نشانے لئے دوسروں کے کندھوں پر رکھ کر لئے ۔ وہ طبعاً کُھل کر سامنے آنے والے آدمی نہیں تھے ، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی ظاہری اخلاق اور رواداری کا رویہ ترک نہ کرتے ۔ یادش بخیر اس زمانے میں کراچی اور لاہور سے انگریزی کا ایک اخبار "سن" نکلا کرتا تھا ۔ ایک بار اس اخبار کے کسی کمپوزیٹر کی غلطی سے جنرل صاحب کے نام کے ساتھ ایک ایسا مخفف شائع ہوگیا ۔ جو انگریزی میں گالی کے طور پر استعمال ہوتا ہے ۔ جنرل صاحب کو ظاہر ہے کہ اس پر غصہ آیا ۔ مگر انہوں نے پریس کانفرنس میں مسکراتے ہوئے یہی اعلان کیا کہ "اخبار نے چونکہ میری ذات کے بارے میں بات کی ہے ۔ اس لئے میں اسے معاف کرتا ہوں کیونکہ میں ذاتی انتقام کا قائل نہیں ۔" لیکن جنرل صاحب کے اس اعلان کا صوتی تأثر ابھی ہواؤں میں گونج ہی رہا تھا کہ "سن" بند ہوگیا ۔

ان دنوں آئل اینڈ گیس ڈیویلپمنٹ کارپوریشن کے چیئرمین ڈاکٹر شہزاد صادق تھے ۔ بعض اخبارات نے اُن کے خلاف الزامات کا طومار باندھ دیا تو اُنہوں نے سٹیٹ گیسٹ ہاؤس کی ایک سرکاری ضیافت میں جنرل صاحب کی توجہ اس جانب مبذول کروائی ، جنرل صاحب نے حسبِ معمول ، خندہ پیشانی سے جواب دیا ۔

"ڈاکٹر صاحب آپ فکر نہ کریں ، میں ان لوگوں کو ٹھیک کر دوں گا ۔ آپ کو متردّد ہونے کی اب کوئی ضرورت نہیں ۔"

ضیافت سے واپس پر ڈاکٹر شہزاد صادق نے سابق وزیر زراعت ملک خدا بخش بُچہ کو اپنی گاڑی میں بیٹھنے کی دعوت دی ۔ تنہائی میسر آتے ہی اُنہوں نے بتایا کہ آج جنرل صاحب نے اُن کی مکمل تسلّی کرا دی ہے اور اب فکر کی کوئی بات نہیں رہی ۔ بچہ صاحب ان کی باتیں سنتے اور مسکراتے رہے اس موقع پر وہ ڈاکٹر شہزاد صاحب کو یہ نہ بتا سکے کہ اسی محفل میں ، ڈاکٹر شہزاد صادق سے ملنے کے بعد جنرل صاحب نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بچہ صاحب سے کہا تھا کہ میں نے انہیں نوکری سے برطرف کر دیا ہے ۔ اور

واقعی اگلی صُبح ڈاکٹر شہزاد صادق فارغ کر دیئے گئے ۔

جنرل اقبال خان اور جنرل سوار خان کے ساتھ بھی یہی ہوا ، صدرِ مملکت ایبٹ آباد جا رہے تھے کہ راستے میں اچانک گاڑی روک کر پچھلی گاڑی میں آنے والے انٹر سروسز پبلک ریلشنز کے ڈائریکٹر بریگیڈیئر صدیقی کو طلب کیا ۔ اور ایک پریس ریلیز ان کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے حکم دیا کہ اسے جاری کر دیں ۔ یہ پریس ریلز دونوں متذکرہ جرنیلوں کی نوکری سے فراغت کے بارے میں تھا ۔

ظاہراً وہ ایک نیک نفس ، متدیّن اور نرم مزاج حکمران تھے ۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ غصہ کی شدّت میں اپنے ، ماتحتوں کو گالی تک دے بیٹھتے ، ان میں معافی کا جذبہ سرے سے تھا ہی نہیں ۔ نتیجہ یہ کہ ان کی "شہادت" کا غبارہ زیادہ دیر تک نہ اڑ سکا ، سانحۂ بہاولپور کو دو ہفتے بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ اخبارات نے ان کے بارے میں تند و تیز مضامین شائع کرنا شروع کر دیئے ۔ اُنہوں نے اپنے گرد خوشامدیوں کا جو ٹولہ اکٹھا کر رکھا تھا وہ چونکہ کسی ذہنی وابستگی یا اصولی مؤقف کی بناء پر ان کے ساتھ نہیں تھا اس لئے ان کی حمایت میں خود ان کے صاحبزادوں کے سوا کوئی بھی بروئے کار نہ آیا ۔ اور جس وقت ملک بھر کے اخبارات و جرائد جنرل صاحب پر تنقید میں مصروف تھے ۔ گیارہ سال تک ان کی خوشامد میں مصروف رہنے والے ان کے مدح خواں اخبار نویس وزیر اعلیٰ نواز شریف کے پبلسٹی سیل میں شامل ہو کر ان کی انتخابی مہم چلانے میں جُت چکے تھے ۔

یہ سب باتیں ریکارڈ پر لانے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ آئندہ حکمران ان معاملات سے عبرت پکڑیں اور اُنہیں اندازہ رہے کہ قومی زندگی میں عوام کے خلاف کی جانے والی سازشیں نہ تو دیرپا ہوتی ہیں اور نہ زیادہ دیر تک پردۂ اخفاء میں رہ سکتی ہیں ۔

جس وقت یہ سطور زیرِ قلم ہیں ، ملک انتخابی مراحل سے گزر رہا ہے ، اور آئینی سربراہ کی طرف سے بار بار اس امر کی یقین دہانی کرائی جا رہی ہے کہ آئندہ حکومت ، منتخب نمائندوں کے حوالے کرنے میں تعویق و التواء سے کام نہیں لیا جائے گا ۔ ہماری ملّی تاریخ شاہد ہے کہ قومی سطح پر ہمارے بڑے المیے صرف اسی وقت پیدا ہوئے جب حکمرانوں نے اپنی ذاتی سوچ اور فکر کو عوامی رائے کے مقابلہ میں زیادہ اہم سمجھا ، اگر یحییٰ خان ، اقتدار شیخ مجیب الرحمٰن کے حوالے کر دیتے ، اگر جنرل ضیاءالحق اسلام کے نام پر غیر جمہوری سوچوں کو فروغ نہ دیتے تو آج ہم وہاں نہ ہوتے ۔ جہاں ہیں ، مشرقی پاکستان بنگلہ دیش نہ بنا ہوتا ۔ جغرافیائی دوریاں ، دلوں کے بُعد میں تبدیل نہ ہوتیں ۔

جنرل ضیاءالحق گیارہ برس تک ایک ہی راگ الاپنے میں مصروف رہے اور وہ یہ کہ ملک کو سیاسی جماعتوں اور مغربی جمہوریت سے خطرہ ہے ۔ ایسا کہتے وقت وہ یہ بھول جایا کرتے کہ اس ملک کی تخلیق کا عمل ایک سیاسی جماعت ہی کے ذریعہ مکمل ہوا اور قائدِ اعظمؒ نے جمہوریت ہی کو اس ملک کے بقاء کی ضمانت

قرار دیا تھا ، ذوالفقار علی بھٹو کے بقول ہمسایہ ملک بھارت کی بقاء کا راز ہی یہ ہے کہ وہاں جمہوریت کے شوروغوغا کو کچلنے کی ہمت کسی بھی شخص میں پیدا نہیں ہوتی ۔ اور بدترین افراتفری کے عالم میں بھی وہاں مارشل لاء نافذ کرنے کے بارے میں نہیں سوچا جاتا ۔ جب کہ مسلسل مارشل لاءوں کے نفاذ نے ہمیں اقوامِ عالم کے سامنے مذاق بنا کر رکھ دیا ہے ۔ اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ جو بھی حکومت برسر اقتدار آئے وہ کم از کم پانچ برس تک ملک میں "قومی اتفاق رائے" کی کیفیت پیدا کر کے معاملات چلانے کی کوشش کرے ، اگر ہمارے سیاستدان جینوا سمجھوتہ پر غور کے لیے اکٹھے ہو سکتے ہیں ۔ اگر انہیں انتخابی ضوابط اور دیگر ہنگامی امور پر مشاورت کے لئے طلب کیا جا سکتا ہے تو ملک کو چلانے اور بچانے کے لئے وہ سر جوڑ کر کیوں نہیں بیٹھ سکتے ۔ اس وقت کیفیت یہ ہے کہ مشرقی سرحد پر بھارت ہماری آزادی کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ، اور مغربی سرحد پر جنرل ضیاءالحق کی مہربانی سے ہم ایسے حالات کا شکار ہیں کہ ادھر سے بھی ہمیں تخریب کاروں کے سوا کوئی سوغات ارسال نہیں کی جاتی ۔ ان حالات میں ہمارے سیاستدانوں ، فوجی جرنیلوں اور دیگر اہل الرائے حضرات کو مل بیٹھ کر آئندہ کے فیصلے کرنا ہوں گے ، اور یہ بات یاد رکھنا ہوگی کہ ہماری ساری عزت ، ہمارا سارا وقار ، ہمارا تمام تر طنطنہ محض اس ملک کے ساتھ ہے ۔ اگر خدانخواستہ خاکم بدہن ، یہی نہ رہا تو ہماری ساری شان و شوکت ، ہمارا تمام تر کروفر بھی نہیں رہے گا ۔

وما علینا الا البلاغ

.....○.....

GENERAL ZIA KAY GAYARAH SAAL

AZHAR SUHAIL

ضمیمہ جات

انگریزی مسودات کی نقول من و عن

Ferozsons (Pvt.) Ltd.
LAHORE–RAWALPINDI–KARACHI

PAKISTAN AIR FORCE

PROCEEDINGS OF THE BOARD OF INQUIRY INTO AIRCRAFT ACCIDENT OF C–130B S No 62–3494 ON 17TH AUGUST 1988

1. **Authority Ordering Inquiry**
Air Chief Marshal Hakimullah NI (M) SJ, SBt, TBt,
Chief of the Air Staff

2. **Ordered on:**
17th August, 1988 vide RNA/262

3. **Composition of the Board:**

President:	Air Cdre Abbas H. Mirza, Pak/4333, GD(P), ACAS (FS), AHQ.
Members:	Air Cdre Muzammil Saeed, Pak/4272, MT Engg, Comdt CAE.
	Gp Capt Zaheer H Zaidi, Pak/4562, GD(P), AIB, RAHQ.
	Wg Cdr Sabahat Ali Mufti, Pak/5709, GD (P), PAF Chak.

4. **US Technical Assistance and Advisory Team**

Colonel Daniel E Sowada,	USAF
Lt Col Bruce Blocher,	USAF
Major William Rouse,	USAF
Captain Stuart Takahara,	USAF
Captain Dennis Simonson,	USAF
Captain William Callahan,	USAF

5. **Terms of Reference**
   (a) To inquire into the circumstances under which Hercules C–130 Aircraft S No. 62–3494 crashed on 17th August, 1988.
   (b) To assess the extent and cost of damage.
   (c) To apportion blame, if any.
   (d) To make recommendations to avoid recurrence of similar nature.

INTRODUCTION

1. The technical inquiry into the fatal aircraft accident of C–130 S No 62–3494 carrying the President of Pakistan General Muhammad Zia-ul-Haq, H. E. the Ambassador of the United States of America, Mr Arnold Rapheal, and 29 other passengers has been completed. The PAF Board of Inquiry received the help of a United States Technical Assistance and Advisory Team along with experts in the field of forensic medicine, flame patterns, aircraft structures and explosives.

2. During the investigation of the accident, the Board members interviewed numerous witnesses who saw the mishap aircraft before the crash. In addition exhaustive laboratory tests regarding the aircraft structure, instruments, engines, propellers and flight controls were conducted both in-country, and in the USA. The documentation of this evidence is about three hundred and fifty pages long. This condensed version of the main report retains the original investigation and analysis of the accident along with the Board's Findings and Recommendations.

INVESTIGATION AND ANALYSIS

Introduction

1. On 17th August, 1988 at approximately 1551E Pakistan Air Force C–130B, serial No 62–3494 from the 35th Air Transport Wing, Chaklala Air Base, impacted in a desert area approximately 7.5 nautical miles, 312 degrees bearing from Bahawalpur Airport, Pakistan. The aircraft was destroyed and all crew members and passengers on board were fatally injured. Coordinates of the mishap site are North 29 degrees 26', East 71 degrees 36'. The mishap flight was a Very Very Important Person (VVIP) mission carrying the President of Pakistan and his party from Chaklala Air Base to Bahawalpur and return. The aircraft, call sign "Pak–1", departed Chaklala Air Base at 0821E for an uneventful flight to Bahawalpur landing at 0927E. The President and his party attended M1A1 tank trials and then returned to the airport approximately 1530E. The aircraft took off at 1546E for Chaklala. The local weather at Bahawalpur was clear and five miles visibility, light south westerly winds and a temperature of 37 degrees C. Weather was not a factor that contributed towards the accident. Numerous witnesses reported that the takeoff and initial climbout were normal. Shortly after the initial turn on course from runway 26, the aircraft was observed to be very low over the Sutlej River and varying about the pitch axis in an up and down motion. Some motion was also noted in yaw and roll. The pitching continued to worsen, according to witnesses, until a steep dive, steep climb, and near vertical dive resulted in the aircraft impacting the ground at approximately 1551E. The impact with the ground was estimated to be approximately 60–65 degrees.

Board Investigation

2. The Board thoroughly examined and scrutinized all available evidence to include the wreckage at the crash site, witnesses statements, aircraft documents, strip examination of aircraft parts, chemical analysis, medical investigation results, maintenance procedures and practices and the security arrangements. With this available evidence the Board concluded that the aircraft was fully serviceable when it departed Bahawalpur airport. The succeeding paragraphs review and analyse the Board's investigation.

Aircraft Fire

3. (a) *Inflight.* All witnesses statements were carefully evaluated and certain key witnesses were interviewed again. Although there were deviations between individual statements, the majority of the witnesses agree that the aircraft was not on fire prior to impact. A witness who said that he saw smoke coming from the back of the aircraft was questioned again and maintained his claim that he saw fire. There is a strong possibility that this smoke was normal because the aircraft was seen at a very low altitude. Careful technical analysis of the wreckage also revealed no evidence of inflight fire. The higher temperatures associated with inflight fires would rapidly melt down aluminum panels and would either show a streaking pattern conforming to the air flow or splattering on the leading edges of the horizontal and vertical stabilizers. No evidence of this nature was found.

(b) *Ground.* Careful analysis of the wreckage indicated damage normally associated with low temperature post impact ground fires. Because post impact ground fires accounted for all fire damage, aircraft fire was not considered a factor in the mishap.

Aircraft Configuration and Cargo

4. The aircraft was configured without cargo rollers. The main cargo compartment item was a 21 foot long by 8 foot wide by 7 foot high VVIP capsule weighing approximately 5,000 pounds. This plywood and metal structure was a locally manufactured capsule. It contained an air conditioning system separate from the aircraft system as well as an independent lighting system. Two 12 volt and one 24 volt lead acid batteries provided dedicated power. The capsule's wheels were retracted when in the aircraft, and it was secured to the floor tie down fittings with numerous cargo straps. Additional cargo was a MA-1A external GTC secured to the cargo ramp. Two crates of mangoes and a presentation case of aircraft models were loaded on board at Bahawalpur.

Aircraft Instrumentation and Electrical Systems

5. Several instruments were recovered from the wreckage. They were extremely fragmented and some were destroyed to the extent no analysis could be performed.

6. Based on technical evaluations and investigation the following significant determinations were made:

(a) Normal electrical power was available and was being used at the time of impact, and the electronic components were functioning at the time of impact.
(b) The attitude reference corresponded to wings level to 5 degrees right wing down, and 60–65 degrees nose down.
(c) The engine speed was normal at 100 per cent RPM.
(d) The vertical velocity indicator read 3400 feet per minute rate of descent.
(e) Fuel pumps were operating normally as determined by impact damage analysis.
(f) Two aircraft clocks were recovered and showed that they had stopped at 1551E with one clock showing 4 minutes elapsed time.
(g) All major flight controls surfaces were recovered or accounted for. Flight control trim settings were measured to be:–
    (i) Aileron Trim. 3.30 degrees down tab indicating a slight right wing up trim setting.
    (ii) Rudder Trim. 1.24 degrees left.
    (iii) Elevator Trim.
        (A) Right inboard = 2.32 degrees down tab.
        (B) Left outboard = 1.60 degrees up tab.

Note:–The dichotomy between up left outboard and down left inboard tabs is within limits of plus or minus two degrees tolerance.

(h) Flaps were in the up position with no evidence of pre-existing material failure or asymmetry; and the landing gear was up and locked. Actuator positions of the elevator, rudder, and ailerons were measured but the probability of actuator movement at impact renders these measurements less reliable than observations obtained from boost packs/actuators examined at OCALC.

Propellers

7. (a) All four propeller barrels and dome assemblies were recovered. Blades were separated at the hub during aircraft impact and most blade tips were bent forward with a minimum of tip shatter. The general lack of blade tip shatter is indicative of relative low

engine torque/power setting.
(b) Barrel impact markings were evident on blade shim plate protractor to establish a reference between the blade and that barrel. The blade angles at impact were determined to be 37 degrees for all propellers.
(c) The combination of these two factors, lack of propeller tip shatter and positive blade curl, indicate an approximate airspeed at impact. This speed range is derived from the 37 degree blade Angle Chart. The assumption that one half of the cruise power required torque equates to the low power associated with the lack of tip shatter. TOIC–130B–1–1 lists cruise power torque at approximately 7000 inch–pounds (in-lbs), therefore, an estimated 3500 in-lbs would be a reasonable low power setting. This torque, coupled with the 37 degree blade angle equals to 175 KIAS. (Using a 1000 in-lbs tolerance equals 6 KIAS, a generous range of estimation). The positive blade curl indicates that some power was being generated, that is, more than zero in-lbs. The same 37 degree blade chart indicates the maximum airspeed for zero torque is 195 KIAS. (At 200 KIAS there would be negative torque signals generated and propellers would be individually correcting for this by varying blade angles. Thus some value other than a constant blade angle would have been found). Therefore, the board determined that the impact airspeed was most logically in a range of 170 to 195 KIAS. The propellers were, therefore, functioning normally at the time of impact.

Engines

8. (a) The inspection of all four engines revealed heavy rotational damage in the compressor or turbine section, wherever case deformation and blade rub occurred. This indicates normal engine operation.
(b) There were no indications of an engine malfunction at the time of the mishap.

Fuel Contaminates

9. *Fuel Contaminates.* A Fuel sample was taken from the fuel truck prior to refuelling the mishap aircraft at Chaklala Air Base. Analysis showed no abnormalities in the JP–4 tested. Fuel contaminates were not a factor in the mishap.

Structural Failure in Flight

10. (a) Pieces of structural components were examined for prior

failures, pre-impact fire indications, and causes of failure. Critical pieces were examined visually with the aid of a magnifying glass. The location of the pieces found relative to the impact area was also considered.

(b) The outer wing was broken into numerous small pieces and scattered away from the impact site. Examination of these pieces revealed sharp fragmented pieces with no fire damage on the pieces. This is consistent with damage sustained from the explosion at impact. No evidence of unrepaired prior damage was found on the outer wing pieces.

(c) The center wing was mostly located in the impact area. Examination of the failed center wing pieces revealed structural break up from overload due to impact. Fire damage found on the center wing resulted from post impact fire. No damage prior to impact was found on the center wing structure.

(d) The forward and center fuselage were found in the main impact area. These were mostly destroyed by impact and fire. Examination revealed no damage prior to impact. The aft fuselage and empennage were found forward of the impact area. The sloping longerons and end fittings failures were examined. This examination revealed that these components failed due to impact. Fire damage for these parts were typical of post impact fire. No evidence of prior failure was found on the aft fuselage and empennage.

(e) The airframe was intact when the aircraft impacted the ground. Examination of structural components revealed that structural integrity was adequate to assure safe operations when operated within the limitations specified in TO IC–130B–1 and applicable supplements.

(f) It is concluded that the aircraft did not disintegrate in flight and was structurally sound till the crash.

Explosive Ordnance

11. *Explosive Ordnance.* The wreckage was examined for the presence of either an improvised explosive or military ordnance. No unaccountable recognizable fragments, components of, or complete items of external ordnance were found. The accident is; therefore, not attributable to ground fire (Missile, Rocket etc.).

Human Factor

12. The board investigated whether human factors relating to the

crew contributed or caused the accident. The aircraft crew that is the Captain and his co-pilot were in excellent physical condition as such coincidental myocardial infraction or other illness is ruled out. The crew had had adequate rest and were under no stress. The Board also ascertained the fact that the mishap aircraft was not in a critical stage of flight (Take off or landing) where poor judgement or technique on the part of the pilot could have caused or contributed to the crash. This factor is, therefore, considered not contributing towards the accident.

Discussion

13. Having considered and ruled out the possibilities of the accident being caused by weather, in flight fire, propeller failure engine failure, fuel contamination, structural failure in flight or the use of external ordnance to down the aircraft the Board focused its attention on a control problem in specific the elevator control failure or the possibility of sabotage. Interviews with the witnesses led the Board to believe that the mishap aircraft executed abnormal manoeuvres in the pitching plane before the final impact. This fact was further collaborated by the scar marks of the aircraft impact with the ground and analysis of the wreckage.

14. The Board studied the problem in great detail and came out with two hypothesis:–

(a) Control problems in the pitching plane could have been caused by a mechanical or a hydraulic fault in the aircraft systems.

(b) Induced by the pilots either voluntarily or involuntarily.

15. The succeeding paragraphs address both the possibilities:

Brief Description of the Elevator Control System

16. The C–130 aircraft has double redundancy for elevator controls. The aircraft has two hydraulic systems namely the booster and the utility systems. Each system is entirely independent of the other and has its own hydraulic pumps and reservoir, its dedicated plumbing which includes filters valves and actuators. Either system can take on the full load of the elevator control if one fails. Mechanically also both the systems are independent in that if a mechanical failure on the cables of one system occurs, the control and safety of the aircraft is not endangered. Lastly if the aircraft looses all its hydraulic fluid it can be controlled manually. In this situation extreme

forces are required to manoeuvre the aircraft. Though the systems are independent of each other there is one point where the operation of one system can effect the other. This is discussed in more detail in para 26.

17. It is a fact that high levels of contamination in hydraulic system do result in unusual wear and, therefore, maintenance procedures emphasize the need for prevention of excessive contamination. The systems themselves are protected by micron filters, whose purpose is to filter out contaminants before they can reach the sensitive operating parts of the system to cause possible malfunctioning of the operating servo valves and operating pistons. Inspection procedures of these systems are designed to ensure that contamination within the system is detected and rectified well before it can become a problem.

18. Since the Board focused on the elevator booster package as the possible cause of the accident, the package was recovered from the wreckage and dispatched to the USA for a tear down analysis. The main features of this report are that extensive contamination was found in the elevator boost package and more so that both systems had been effected. The subject of contamination is discussed in detail in paragraph numbers 22 to 27.

Mechanical and Hydraulic Failures

19. *Damage to the Tail Plane and Elevator Surfaces.* Loss of control in the pitching plane could result from damage to the tail plane or elevators of the aircraft. Examination at the scene of the accident was indicative that no structural failure or damage occurred to the empennage prior to the impact. Damage to the tail plane or elevators as a cause or contributory cause for the accident is ruled out.

Mechanical Failure of the Elevator Control System

20. Failure of the mechanical linkage from the pilot's control to the hydraulic elevator booster control valves, and mechanical linkage from the booster actuator rods to the elevators were investigated. There were several flight control cables found frayed and/or broken. Lockheed engineering analysis revealed that these cables were of the proper length and that the frayed ends were caused by failure of the cables in tension overload when they pulled out of the cable end swage fitting. The integrity of flight deck control linkage

on elevator and rudder cables forward of fuselage station 850 could not be determined due to the complete destruction of the fuselage. Analysis of the evidence indicates that a mechanical failure of the elevator control system had not occurred prior to impact. Failure of the elevator control system due to a mechanical failure as a cause for the loss of control and the accident is ruled out.

Lockheed Simulator Information

21. Lockheed Safety Investigators and Board Members reviewed the mishap site and all crash information gained at Bahawalpur. Possible flight profiles, available meteorological data, and known aircraft information was compiled and loaded into Lockheed flight simulation computers. The most valuable resultant information was that hydraulic pressure would be required to position the flight controls to the extremes needed to match witness and impact evidence. The manoeuvres executed support the findings in paras 19 and 20 that the linkage between the pilot's controls and the elevator boost package was intact and operating.

Malfunction or Failure in Hydraulics of the Elevator Boost Package

22. (a) The elevator boost package was sent to the USA for a tear down analysis. The report received states that high levels of contamination by non-organic matter consisting of aluminum and brass particles was found. The size of the particles was stated to be from one to one hundred plus microns, and the contamination was far in excess of the threshold listed in T O IC-130H-2-3. The hydraulic fluid samples were taken from both actuators of the elevator boost pack. Both servo valves, that is the control valves were in good condition with no evidence of scoring or binding. Impact marks found in the actuator cylinders were at the fully retracted position which corresponds to a full nose down elevator position. Visible metal particles were found embedded in the elevator booster assembly filters. The source of brass particles is considered to be most likely the piston shoes in the hydraulic pumps that could come from failing/failed Engine Driven Pumps (EDPs). The EDPs were recovered from the wreckage and although these had been subjected to high temperatures of ground fire, no signs of their operational failure were evident from a visual examination. The EDPs were then despatched to PINSTECH for a detailed

laboratory analysis. In addition to the EDPs recovered from the mishap aircraft, a sample from a serviceable EDP was also analysed. The PINSTECH report states that no signs of failure or impending failure was seen in the EDPs of the mishap aircraft. The conclusion, therefore, is that the brass particles did not originate from the EDP.

(b) Three EDP filters and two accumulator system filters down stream of the pumps were also recovered from the wreckage and examined. They had all been subjected to the high heat of the ground fire after impact. However, the pins designed to indicate contamination of the filters had not protruded. This in itself indicates that there was no high level of contamination in the filters. The elements of these filters had been subjected to the high heat of ground fire as well and were found to be severely heat affected. The filter elements were examined and no visual signs of contamination were evident. Further laboratory examinations have been conducted on these filter elements, but these have been inconclusive. However, the available evidence that is the indicator pins not having extended, is indicative of the fact that high levels of contamination had not occurred between the EDPS and the elevator boost package.

(c) To further check on how the contamination got into the system a telex was sent to Lockheed Aircraft Company, the manufacturers of the C–130 aircraft querying them on how such high levels of contamination got into the system. The reply from Lockheed stated that the only way such contamination could enter into the system was either due to maintenance, or due to a failing or a failed pump. Since the Board had already ruled out a failed or a failing pump, the question of maintenance was also investigated. This aspect is discussed in paragraph 23 below.

Contamination due to Maintenance

23. The Board looked into the servicing and maintenance procedures of the C–130 in the PAF. Although the Tech Orders do not specify any time period for hydraulic fluid change, the PAF follows a thirty days cycle to guard against contamination. In addition the mishap aircraft had come out of a major (D-4) inspection just thirty days prior to the accident and had flown fifty hours. In this inspection the elevator boost package filters and the hydraulic fluid from the reservoirs were changed. No flushing of the hydraulic systems is necessary according to the TOs. Flushing is only required if an

EDP fails while an engine is running. Nevertheless, to back track further, filters on all the C–130's were checked. All were found serviceable. Samples of the hydraulic fluid was also taken at random from four other C–130's. This fluid was checked both visually and through laboratory tests. The tests show that contamination was within the prescribed limits. The conclusion is that the maintenance procedures for the C–130 are adequate, otherwise contamination outside the limits would have shown up on other aircraft as well.

24. After investigating and ruling out the possible causes of contamination as spelled out by the manufacturers of the C–130, the Board cannot with the available evidence, explain the source and levels of contamination found in the elevator booster package. Nevertheless, as explained in para 27, the high level of contamination could result in excessive wear only, but not cause the accident.

Mechanics of a Control Problem

25. The Board also investigated various types of failures within the boost package that could lead to such an accident. After studying the hydraulic systems in detail, the Board concluded that the only way an elevator boost package could fail leading to a complete loss of aircraft control would be through the failure of the control valve.

26. The linkage that moves the control valve to uncover parts to direct the pressures of the hydraulic fluid to the actuators of the boost package is common. The positioning of both the control valves is also common and synchronized. Both system control valves are positioned mechanically by pilot inputs through fore and aft movement of the control columns in the cockpit. Should one or the other of the control valves stick or jam, it will result in the control valve piston maintaining a synchronized or similar position. The mechanics of such a malfunction can occur in the following manner. If one of both of the control valves get stuck, then the elevator surface will move to the full throw position in the direction dictated by the control valve position. As a corollary the yoke would move without further pilot inputs. Input now by the pilot in the opposite direction or the same direction, either to reverse, stop or increase the movement of the flight surface, would be resisted by the stuck/jammed control valve and no actual movement of the control column or linkage to move the control valve would occur. Further

effort by the pilot could result in the unsticking of the jammed control valve and sudden change of its position to a new one in the direction dictated by the force applied. Such positioning would direct 3000 psi to the booster and utility actuators, to drive the control surfaces in the direction dictated by the pilot input. Should the control valve piston again stick/jam at this new position the control surfaces would be driven to the maximum up or down position as stated earlier. Inputs by the flight crew if increased sufficiently would again move the valve in the opposite direction resulting in a reversal of the elevator position. Switching off one or the other of the hydraulic systems would not alleviate the problem. In such a case only 50% of the hydraulic effort would be available for movement of the elevator control surfaces. Slower movement of the surfaces may result but nevertheless, the control surfaces would move in the manner described.

27. The possibility of a control valve failure is ruled out in this case because the common mechanical linkage to move the control valves was found intact and also the fact that according to the elevator boost package tear down report, the valves were free with no evidence of binding. The servo valves were also disassembled and no signs of scoring or binding were detected. The Board's opinion is that there is no other way of jamming the controls. Moreover Lockheed has stated in their reply to the Board's questions that even with the levels of contamination found in the system they have not normally experienced any problems other than wear. This confirms the Board's finding that contamination of the elevator booster package may at worst cause sluggish controls leading to over control but not to an accident.

Sabotage as a Cause

28. Although 31 death certificates have been received no physical body count was carried out at the wreckage site or in the hospital. Considering the state of disintegration of the bodies, such a body count was not possible. The other area of concern to the investigators was the possibility of a criminal mischievous act in some form that could conceivably cause the loss of control and the subsequent accident. An act of sabotage that could result in the abnormal behaviour of the aircraft just prior to its impact with the ground could be achieved in the following ways:–

(a) Mechanical or Deliberate interference with the flight control system.

(b) Physical interference with the controls in the cockpit.
(c) Incapacitation of the pilots at the controls either singly or simultaneously as a result of a criminal act.
(d) Explosive devices used in some manner so as to achieve either (a), (b) and (c).

Mechanical or Deliberate Interference with the Flight Controls

29. The available evidence does not support a failure or tampering with the control system mechanical linkage and this aspect is ruled out as a possible cause for the accident. An examination of the elevator boost control package in situ on another aircraft led the Board to believe that deliberate contamination of the elevator boost package was possible. This could be done by a knowledgeable person who had suitable tools and the opportunity to do so. The time required to tamper with the elevator booster package is the order of two or three minutes provided the saboteur had practised the operation. In the absence of a reasonable explanation for the contamination this possibility, though very remote cannot be ruled out.

Physical Interference with Controls in the Cockpit

30. Without the benefit of a cockpit voice recorder to establish what actually transpired on the flight deck prior to impact, the possibility of physical interference with the cockpit controls cannot be totally ruled out. This would include an attempt by a hijacker to take control of the aircraft or in a suicide attempt to crash the aircraft. There are more persons on the flight deck than just the two pilots. It is considered to be a remote possibility that both pilots could be over'powered simultaneously. Neither is it considered likely that one pilot could move the controls to the limits against the determined efforts of the other pilot trying to maintain control. It must be remembered that the problems of control continued for some two minutes prior to impact. The possibility of physical interference with the controls though not ruled out on the basis of any evidence to the contrary, cannot be considered seriously.

Incapacitation of the Pilots

31. The Board also discussed at length, various methods that could be employed to induce incapacitation of the flight deck crew. These methods could vary from the very simple to the ultra sophis-

ticated. The very simple techniques would be conventional in nature and would invariably leave obvious telltale signs. The Board did not find such evidence in the wreckage.

32. The use of ultra sophisticated techniques would necessitate the involvement of a specialist organization well versed with carrying out such tasks and possessing all the means and abilities for its execution. Such acts of sabotage are extremely difficult to detect even by employing sophisticated detection techniques. The Board feels that a chemical agent may well have been used to cause incapacitation of the flight deck crew. The chemical agent could have been packaged in innocuous containers such as beverage tins, gift parcels, aerosol cans, thermos flasks etc and smuggled on board without arousing suspicion. The activation of these gases during flight, either manually, remotely or automatically, would result in the insidious incapacitation of the flight deck crew. Insidious incapacitation can be caused by simple gases like carbon mono oxide which is colourless and odourless and is, therefore, impossible to detect. The absorption rate of this gas in the blood is 200 to 300 times that of oxygen. Carbon mono oxide will impair judgement and deteriorate muscle coordination before death occurs. Other agents like carbon mono oxide but much more efficient may well exist. The presence of insidious chemical agents would not cause alarm and the flight crew would not take preventive steps by donning helmets and masks to breathe pure oxygen. It was positively determined by the evidence at the crash site that the flight crew were not wearing their helmets and oxygen masks at the time of the crash.

33. The determination of an act of sabotage of this kind is not easy to substantiate. Autopsies on the bodies of the persons on the flight deck and the crew could have provided some definite answers towards this end. But unfortunately, no proper autopsies on the flight deck crew were carried out. The use of a chemical agent to incapacitate the pilots and thus perpetuate the accident, therefore, remains a distinct possibility.

Use of an Explosive Device

34. In the course of the Board's investigation to establish the use of an explosive device to cause damage to the flight control system, an examination of the wreckage by experts revealed no evidence of a high intensity or low intensity explosion on or in the aircraft. The

aircraft wreckage had been subjected to severe ground fire and it must, therefore, be considered possible that some evidence especially that in the case of a low intensity explosion could have been destroyed. Whilst a high intensity explosion can be ruled out on the basis of absence of evidence the same cannot be stated in the case of a low intensity explosion.

35. Samples of aircraft structure and other associated aircraft debris were recovered from the wreckage scene which were considered unusual. These samples were examined and analyzed at PINSTECH Laboratories. The PINSTECH analysis revealed the presence of a number of elements on the surfaces of these samples. Some of the elements discovered are not normally present in aircraft structures or in the fuel, lubricants, and other equipment on the aircraft. Effort, therefore, was made to establish the source from which these elements came to be on the wreckage. To this effect extensive analysis of the soil as well as other non-standard materials that were on board the mishap aircraft was carried out. Most of the elements, except antimony and phosphorus in the quantities found could be explained. The unusual elements like potassium, chlorine and sodium could be traced to definite parts of the aircraft structure such as fuel and lubricants, equipment on board the aircraft, the soil at the accident site, and the fire fighting agent used. Only the quantities of such elements discovered is not fully potassium on a mango seed and antimony and chlorine on the mango peel. The cockpit supporting rod had high levels of phosphorus and antimony. The aft cargo door area had high levels of phosphorus, antimony and sulphur.

36. The Alcohol, Tobacco and Firearms (ATF) Laboratory report states that traces of PETN (Pentaerythritol Tetranitrate) which is a secondary high explosive, were found on the butt end of the emergency escape hatch rope. This rope is in the aft cargo door area. Although the ATF report discards the theory of a high intensity explosion, the presence of PETN is unusual, especially when viewed with the presence of antimony and phosphorus in the same vicinity.

37. Experts at POF Wah have been able to fashion detonators from the elements found, thus demonstrating the fact that the use of a detonating device could be suspected. The use of a detonator for an unknown purpose is a possibility. The evidence to the contrary is available which proves that the elevator mechanical control

linkage was complete and operating right upto the time of impact (Reference para 19 and 20).

38. Low intensity explosives could be employed to fire pressurized bottles containing poisonous gases which could result in total or partial incapacitation of the pilots and other persons on the flight deck. The action of the gas would have to be sudden and insidious so as to ensure that no person on the flight deck would have time to don his helmet and oxygen mask and to go on to pure oxygen. Incapacitation as the result of employing a low intensity explosive for the purpose considered above, cannot be ruled out.

39. The foregoing discussion on the use of explosives for the purposes discussed is based on the presence of certain unexplained elements found on the parts of the wreckage. These elements can be fashioned into detonating devices as demonstrated by POF, WAH, but there is no factual evidence to identify the purpose for their use. The only autopsy conducted was on the body of Brig Gen Wassom, who was most probably seated in the VIP capsule. As such the conclusions drawn from his autopsy would relate only to the condition within the capsule and are not indicative of the environment on the flight deck. The absence of explosives type injuries in his case also cannot be used other than to deduce the fact that he had not been effected by any explosion, but not to reach a conclusion that an explosive device had not been used. The lack of evidence in this area of investigation must be recognized as a serious drawback to come to a definite conclusion. In the final analysis the presence of the unexplained elements including the PETN arise suspicion and cannot be ignored. On the other hand the evidence gathered cannot prove conclusively the use of a low intensity device either.

Cause of the Accident

40. After a thorough analysis of the available evidence, the Board has been unable to substantiate a technical reason for the accident. In the absence of a technical reason the only other possible cause of the accident is the occurrence of a criminal act or sabotage leading to the loss of aircraft control and the eventual aircraft impact with the ground. The Board does not have the expertise nor the competence to investigate a non technical reason for the accident. The Board, therefore, recommends that appropriate government agencies be tasked to investigate further this aspect.

Most Probable Cause of the Accident

41. Criminal act or sabotage perpetuated in the aircraft leading to the crash of the aircraft.

FINDINGS

The Board finds that:–

(a) The crew was medically fit, suitably qualified and were authorized for the mission.

(b) The mishap aircraft was duly pre-flighted and was serviceable prior to take-off from Bahawalpur. All aircraft documents were in order.

(c) The aircraft took off at 1546E and crashed at 1551E. The aircraft impacted in a 60 to 65 degree dive, wings level and was below 200 knots IAS probably between 175–195 knots IAS.

(d) The mishap aircraft exhibited abnormal behaviour in the vertical plane approximately two to two and a half minutes before impact.

(e) Crew fatigue, stress, pilot technique or judgement was not a factor that contributed towards the accident.

(f) Fuel contamination was not a factor that caused or contributed towards the accident.

(g) Weather was not a factor in this accident.

(h) No inflight aircraft fire occurred.

(j) No structural disintegration of the aircraft occurred prior to impact. All major structural parts of the crashed aircraft were present at the impact point.

(k) All the aircraft doors were found to have been in the closed and locked position.

(l) Aircraft configuration at the time of impact was gear and flaps up and all trim tabs were in the neutral or close to neutral position.

(m) Use of external ordnance to cause the accident is not a factor. (No missile, rocket or other external ordnance was used to down the aircraft).

(n) There was no metal fatigue or cracks in the aircraft structure prior to impact.

(o) Engines and propellers were operating at the time of impact.

(p) Hydraulic fluid and electrical power was available till the accident.

(q) There was no signs of a control cable failure prior to impact.

(r) No evidence of a high intensity internal explosion was found.

(s) There was a severe ground fire fed by the aircraft fuel after impact.

(t) All souls on board the mishap aircraft received fatal injuries.

(u) Autopsies on bodies, except that of Brig Gen Wassom, were not performed with a view to discover explosive injuries, usage of drugs or pre-impact incapacitation due to chemical/biological agents.

(v) There was no physical evidence of a low intensity explosion in the wreckage. However, this possibility cannot be ruled out because of the severe ground fire which may have destroyed such evidence.

(w) Foreign elements in unusual quantities were found in the wreckage. The cockpit supporting rod had high levels of phosphorus and antimony. There was a high level of potassium on a mango seed while a mango peel had high concentrations of antimony and chlorine. The aft cargo door showed high levels of phosphorus, antimony and sulphur. Traces of PETN were also found near the aft cargo door on the escape hatch rope and confirmed by the Alcohol, Fire and Tobacco (ATF) Laboratories in USA.

(x) The elements mentioned above may be fashioned to make an explosive initiator/detonator which could be used to set off another charge or activate a mechanical device.

(y) The contamination in both the hydraulic system fluids cannot be substantiated.

(z) In the absence of technical reasons that explain the cause of the mishap, the Board believes that the accident was most probably caused through the perpetuation of a criminal act or sabotage.

RECOMMENDATIONS

1. The Board makes the following recommendations:–
   (a) An investigation be ordered to determine the perpetuators of the criminal act or sabotage.
   (b) Either Digital Flight Data Recorders (DFDRs) or simple Flight Recorders (FDRs) be provided in the VVIP aircraft.
   (c) A new suitably equipped dedicated VVIP aircraft be procured for the VVIP movements in Pakistan and abroad.
   (d) A copy of the manifest of the VVIP aircraft must be left with the ATC of the departure airfield.
   (e) Cockpit Voice Recorders should be installed in all PAF C–130s.
   (f) The feasibility of one pilot staying on aircraft oxygen at all times be studied and if found practicable be implemented.
   (g) The personal flying clothing and other items of life saving equipment carried by the crew of the C–130 aircraft be written off charge as per existing rules and regulations.
   (h) Full state benefits/compensation, under the existing rules, be accorded to the next of kin of the deceased.
   (j) Hercules C–130 aircraft S. No. 62-3494 four, T-56-15 Allison power plants, along with its ancillary equipment should be written off as per existing rules and regulations.

ORDER
BY
THE PRESIDENT, ISLAMIC REPUBLIC OF PAKISTAN

Whereas the objects and purposes for which the National Assembly was elected have not been fulfilled

And whereas the law and order in the country have broken down to an alarming extent resulting in tragic loss of innumberable valuable lives as well as loss of property

And whereas the life property honour and security of the citizens of Pakistan have been rendered totally unsafe and the integrity and ideology of Pakistan have been seriously endangered

And whereas public morality has deteriorated to unprecedented level

And whereas in my opinion a situation has arisen in which the Government of the Federation cannot be

carried on in accordance with the provisions of the Constitution and an appeal to the electorate is necessary

Now therefore I, General Mohammad Zia-ul-Haq, President of Pakistan in exercise of the powers conferred on me by Clause (2) (b) of Article 58 of the Constitution of the Islamic Republic of Pakistan hereby dissolve the National Assembly with immediate effect and in consequence thereof the Cabinet also stands dissolved forthwith.

General
(M. Zia-ul-Haq)

Rawalpindi
12 Shawwal-ul-Mukarrum 1408 AH
29 May 1988

پس پردہ حقائق

جنرل ضیاء کے ۱۱ سال

۴ – جولائی ۱۹۷۷ء کی رات جی ایچ کیو کے کانفرنس روم سے شروع ہو کر ۱۷ – اگست ۱۹۸۸ء کی شام بہاولپور کے قریب ایک حادثہ میں ختم ہوجانے والے گیارہ برسوں کے دوران جنرل ضیاءالحق اور قومی زندگی پر اثرانداز ہونے والے ان کے اہم فیصلوں کا پس منظر کبھی عوام کے سامنے نہ آسکا ۔ مارشل لاء کی پابندیوں کے باعث عوام کبھی نہ جان سکے کہ اندرخانہ کیا سازشیں ہوتی رہیں ۔ مارشل لاء کیسے لگا ۔ ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی کیوں اور کیسے دی گئی ۔ محمد خان جونیجو کو وزیراعظم کیوں بنایا گیا اور پھر برطرف کیوں کردیا گیا ۔ جنرل ضیاءالحق کے اصل عزائم کیا تھے ، وہ کہاں سے چلے اور کہاں پہنچے ۔ یہ تمام حقائق پہلی بار ایک صحافی کے غیرجانبدار قلم سے اس کتاب کی صورت میں منظرِ عام پر آرہے ہیں ۔

1977–88